امتِ مسلمہ کا نصب العین

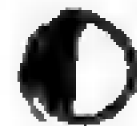
سید احمد عروج قادری



اُمّتِ مُسلمہ کا نصبُ العین

(کتاب وسنّت کی روشنی میں)

سیّد احمد عروج قادری



اسلامک انٹرنیشنل پبلشرز ۔ ریٹی گن روڈ لاہور

حرفِ اوّل

محترم سید احمد عروج قادری صاحب ماہنامہ "زندگی" رامپور کے مدیر ہیں، اور ایک عرصے سے اقامتِ دین کے فریضہ کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کو فکری غذا فراہم کرنے کا فرض بھی انجام دے رہے ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم اُن کی ایک مفید کتاب اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

سلیم احمد فاروقی

منتظم اسلامک انٹرنیشنل پبلشرز

لاہور

فہرست مضامین

کتاب اللہ کی آیات سے استدلال

غلبہ اور اقتدار کس لیے؟

'اقامتِ دین' احادیث میں

غلبۂ اسلام کے بارے میں حضورؐ کی پیشین گوئی

'اقامتِ دین' اقامتِ قرآن کا نام ہے

تخلیقِ انسانی کا مقصد

امتِ مسلمہ کا نصب العین

ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صورت

پیش لفظ

تحریکِ اسلامی کا نصب العین "اقامتِ دین" ہے۔ اس تحریک نے یہ نصب العین اپنے جی سے وضع نہیں کیا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہی رہا ہے اور اب قیامت تک امت مسلمہ کا نصب العین بھی یہی ہے۔ یہ ایک فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں پر عاید کیا ہے۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور خلافت علی منہاج النبوۃ کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔ رشدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ امتِ مسلمہ کے نصب العین — اقامتِ دین — پر کتاب وسنت میں جو دلائل پھیلے ہوئے ہیں انہیں یک جا کیا جائے۔ اس طرح کی ایک کتاب مرتب کرنے میں دو فائدے پیش نظر ہیں، ایک یہ کہ جو لوگ تحریکِ اسلامی سے وابستہ ہیں انہیں ایک ہی جگہ تشفی بخش اور مفصل دلائل مل جائیں اور دوسرا یہ کہ جو لوگ اس نصب العین کے صحیح ہونے پر مطمئن ہونا چاہیں انہیں آسانی کے ساتھ اس کی دلیلوں پر غور کرنے کا موقع مل سکے۔ یہ کتاب اسی احساسِ ضرورت کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں موضوع سے متعلق قرآن و حدیث کے تمام دلائل و براہین کا استقصاء نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو کتاب ضخیم ہو جاتی۔ لیکن جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ کھلے ذہن سے پڑھنے والوں کے لیے ان شاء اللہ کافی ہوگا۔

پورا مقالہ ماہنامہ "زندگی" کے اشارات میں بالاقساط چھپا تھا اور اب عنوانات کی تکمیل کر کے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اشاعتِ حق کا ذریعہ بنائے اور اپنے ایک حقیر بندے کی اس دینی خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین

سید احمد عروج قادری

دفتر ماہنامہ زندگی۔ رامپور۔ یوپی

تاریخ کا ایک مطالعہ

دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے اور بہت سے نظام رائج ہیں۔ آپ ان طریقوں اور نظاموں کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ان میں سے ہر طریقہ حیات اور ہر نظام زندگی کا سلسلہ آگے بڑھ کر کسی ایک فرد پر ختم ہوتا ہے۔ کسی معاشرے کے صرف ایک فرد نے اس کی ابتدا کی، اور اسے پھیلانے میں اپنی پوری زندگی لگا دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک فرد کے نظریۂ زندگی کے سانچے میں ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگیاں ڈھل گئیں اور پورا ایک نظام اُٹھ کھڑا ہوا۔ تاریخ کے اس مطالعے سے دو باتیں اوّل نظر میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک فرد ہزاروں افراد کو متاثر کر سکتا ہے اور اس کی تنہا ذات میں ایک پورا کاروانِ حیات پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ غور و فکر کے بعد جس نظریۂ حیات کو وہ انسانیت کے لیے مفید سمجھتا ہے اس کو پھیلانا چاہتا ہے۔ اپنی راہ کی ہر رکاوٹ دور کرنے کے لیے جان لڑا دیتا ہے اور اپنے نظریۂ زندگی کو کامیاب کرنے کے لئے کسی

قربانی سے نہیں ہچکچاتا۔ اس کی یہ خواہش و کوشش تقاضائے عقل کے عین مطابق ہے یہ بحث بالکل الگ ہے کہ اس نے جس نقطۂ نظر کو انسانیت کے لئے مفید سمجھا وہ فی الواقع مفید تھا یا مضر، کامل تھا یا ناقص۔

زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو درست کرنے کا ایک نظام وہ بھی ہے جس کو ہم اسلام کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی فرد یا کوئی جماعت اس نظام کے مفید انسانیت ہونے پر یقین کا دعویٰ کرتی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے پھیلانے اور کامیاب کرنے کے لیے جدوجہد نہ کرے۔

اس نظام کو دوسرے نظاموں پر پانچ واضح امتیازات حاصل ہیں:

نظامِ اسلامی کے امتیازات

(۱) اس نظام کا خالق انسان نہیں بلکہ اللہ ہے اسی نے اس کو انسانیت کی فلاح کے لیئے نازل فرمایا ہے۔

(۲) یہ دنیا و آخرت دونوں ہی کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے۔

(۳) تاریخ کا طویل تجربہ اور عقل کا مدلل فیصلہ بتاتا ہے کہ یہ نظام انسانیت کے لیئے ہمیشہ مفید ہی ثابت ہوا ہے اور اس میں نقصان کا کوئی شائبہ نہیں۔

(۴) یہ انسان کے تمام داعیات جذبات اور ضروریات کا تسلی بخش جواب ہے۔

(۵) یہ نظام اللہ نے جن افراد پر نازل کیا انہوں نے اسے پھیلانے اور برپا کرنے کی کوشش محض عقلی و جذباتی تقاضے کی بنا پر نہیں، بلکہ اس کام پر اللہ کی طرف سے مامور ہو کر کی ہے۔ تاریخ کے یہی افراد انبیاء کرام علیہم السلام تھے جن کا سلسلہ سیدنا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔

اقامتِ دین کا مفہوم

"اقامتِ دین" میں دین سے مراد وہ دینِ حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عند اللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام اسلام ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ذمہ دار ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظامِ زندگی بھی ہے اور انفرادی واجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔

اس دین کی "اقامت" کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی واجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔

لفظ اقامت کے چند استعمالات

اقامت کے لغوی معنی کھڑا کرنے اور سیدھا کرنے کے ہیں۔ اسی معنی کی مناسبت سے اس لفظ کے متعدد

اصطلاحی و شرعی معنی بھی کلام عرب اور قرآن و حدیث میں مستعمل ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بیٹھے ہوئے انسان کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جائے گا تو اس کے معنی وہ ہوں گے جو اصل لغت میں اس کے معنی ہیں، یعنی کھڑا کرنا جیسے کہا جائے کہ کان زید قاعداً فاقامہٗ خالدًا (زید بیٹھا ہوا تھا تو خالد نے اس کو کھڑا کر دیا) کسی ٹیڑھی لکڑی کے لیے استعمال ہوگا تو اسکے معنی سیدھا کرنے کے ہونگے۔ مثلاً اَقَامَ العُوْدَ (اس نے لکڑی سیدھی کر دی)۔

معنوی چیزوں کے لیے جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے متعدد اصطلاحی و شرعی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز کے لیے یہ لفظ بولا جائے گا تو اقامت صلوٰۃ کے معنی اس کو پورے حدود و شروط کے ساتھ ادا کرنے کے ہوں گے۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز قائم کرو۔ یعنی اس کو ان حدود و شروط کے ساتھ ادا کرو جن کی تعلیم شریعت نے دی ہے۔

یہ لفظ کسی حدِ شرعی کے لیے مستعمل ہوگا تو اس کے معنی نافذ کرنے کے ہوں گے مثلاً اَقَامَ حَدَّ السَّرِقَۃِ (اس نے چوری کی حد نافذ کی) کسی آئین و قانون کے لیے استعمال ہوگا تو اس کے معنی اس کو نافذ اور رائج کرنے کے ہونگے مثلاً اَقَامَ القَوَانِیْنَ الاِسْلَامِیَّۃَ (اس نے اسلامی قانون نافذ اور رائج کیے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

لَحَدٌّ یُقَامُ فِی الْاَرْضِ خَیْرٌ	کوئی ایک حد بھی جو زمین میں نافذ کی
لِاَھْلِھَا مِنْ اَنْ یُّمْطَرُوْا	جاتی ہے وہ اہل زمین کے لیے چالیس
اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا۔	دن کی بارش سے زیادہ بہتر ہے۔

اس حدیث میں اقامت کے معنی نافذ کرنے کے ہیں۔ کسی حد شرعی کو نافذ کرنے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اس پر ٹھیک اس طرح عمل کیا جائے جس کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً

چوری کی حد نافذ کرنے کے معنے یہ ہیں کہ قاضی کے فیصلے کے بعد حکومت اسلامی کا کوئی کارندہ تعلیم نبوی کے مطابق چور کا ہاتھ کاٹ دے۔

دین اسلام چونکہ انفرادی و اجتماعی احکام کا مجموعہ ہے اس لیے کسی حکم مثلاً نماز کے لحاظ سے اس کے معنے اس کو اچھی طرح ادا کرنے کے ہوں گے اور کسی دوسرے حکم مثلاً حدِ زنا کے اعتبار سے اس کے معنی نافذ کرنے کے ہونگے۔ یہ بات بھی ناقابل انکار ہے کہ دین اسلام ایک مکمل قانون حیات اور آئین زندگی ہے اس لیے اقامت دین کے مفہوم میں دین کو نافذ اور رائج کرنا بھی داخل ہے اگر کوئی شخص کہتا ہے۔ کہ اقامت دین کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے قانون حیات اور آئین زندگی کو دنیا میں نافذ اور رائج کیا جائے تو اس کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔

مختلف تعبیرات کا مسئلہ

یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں کسی ایک حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے متعدد اور مختلف تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں یہ فی الواقع کسی زبان کی بلاغت کا مسئلہ ہے۔ وہ زبان بلیغ اور ترقی یافتہ نہیں سمجھی جاسکتی جس میں کسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے بس ایک ہی طرز تعبیر اور یکساں قسم کے سگے بندھے الفاظ کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہ بات بھی اہل علم و اہل زبان کے درمیان معروف ہے کہ متعدد اشیاء کے کسی مجموعے کو ظاہر کرنے یا اس کی نشان دہی کے لیے کبھی اس کے کسی نمایاں اور اہم جزو کا نام لیا جاتا ہے لیکن اس سے مقصود پورا مجموعہ ہوتا ہے عربی زبان دنیا کی بلیغ ترین زبان ہے اور اس کے بہترین نمونے ہمیں قرآن و حدیث میں ملتے ہیں جو لوگ زبان کی بلاغت اور اہل علم کے درمیان اس معروف حقیقت سے ناواقف ہیں

وہ سخت دھوکا کھاتے ہیں۔ دیکھیے، لوگوں کے درمیان یہ حدیث مشہور ہے۔ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا) اب اگر اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ اخذ کرے کہ صرف زبان سے یہ کلمہ کہہ لینا کافی ہے دل میں یقین ہو یا نہ ہو تو ایسا شخص قرآن و حدیث سے نرا جاہل سمجھا جائے گا یا اس حدیث سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ رسالت کا اقرار ضروری نہیں ہے صرف توحید کا اقرار کافی ہے تو اسے بھی حدیث کی زبان سے ناواقف سمجھا جائے گا۔

دین احکام و قوانین کا مجموعہ اور ایک جامع اصطلاح ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد و مختلف تعبیریں اور اسلوب بیان اختیار کیے گئے ہیں۔ کہیں شہادت شاہد اور شہداء علی الناس کے الفاظ سے اس کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ کہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ بول کر اس مجموعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہیں بندگی رب اور اطاعت رسول کا حکم دے کر پورے دین کی پیروی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ کہیں اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ سے اس کی تعبیر کی گئی ہے۔ اور متعدد مقامات پر تو صرف اقرار ربوبیت کو پورے دین کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔

قرآن و حدیث کی ان تعبیرات اور استعمالات سے ناواقفیت کی بنا پر لوگ نہ صرف قرآن فہمی کی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ ان کا تصور دین ہی ناقص ہو جاتا ہے اس موقع پر صرف آخری طرز تعبیر کو واضح کرنے کے لیے ایک آیت پیش کرتا ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا	جن لوگوں نے کہا ہمارا رب
اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	اللہ ہی پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ — فرشتے یہ پیغام لے کر نازل ہوں گے
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا — کہ خوف نہ کرو، غمگین نہ ہو اور اس
وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ — جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے
تُوْعَدُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ ۴) — وعدہ کیا گیا تھا۔

اس آیت میں اقرارِ ربوبیت اور استقامت، پورے دین کو قبول کرنے اور زندگی کے آخری لمحے تک اس کے احکام پر عمل پیرا رہنے کی ایک تعبیر ہے۔

ایمان باللہ (جو دین کا اولین و اہم ترین جزو ہے) کا ذکر پورے مجموعے کی طرف نشان دہی کے لیے کیا گیا ہے۔ اگر اس تعبیر سے کوئی شخص واقف نہ ہو تو وہ سخت دھوکا کھا سکتا ہے۔ ٹھیک یہی اسلوب ایک حدیث میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "آپ مجھے ایک ایسی جامع بات بتا دیجیے کہ آپ کے بعد پھر کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔" آپ نے فرمایا:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ — تم کہو میں اللہ پر ایمان لایا۔ پھر
اسْتَقِمْ (مسلم شریف) — اس پر جم جاؤ۔

اس حدیث میں بھی ایمان باللہ پورے دین کو ظاہر کرنے کی ایک تعبیر ہے تعلیم یہ دی گئی ہے کہ دین کی مکمل پیروی اور اس پر استقامت کو اپنا مقصدِ حیات بنا لو۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بعد اپنی فلاح و نجات کے لیے کسی سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

غلبہ دین کی مختلف تعبیریں، قرآن و حدیث میں جس طرح دین حق کو مختلف انداز

اور متعدد تعبیروں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح غلبۂ حق کی حقیقت واضح کرنے کے لیئے بھی متعدد تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ دین کا اظہار کلمتہ اللہ کا اعلان، باطل پرستوں کی ہزیمت، حق پرستوں کی فتح، کافروں کی ہلاکت، مومنوں کی نجات۔
یہ تمام تعبیرات یہ حقیقت واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالٰی نے انبیاء کرام کو دین حق دیکر اسلئے نہیں بھیجا تھا کہ صرف اس کا پیغام پہنچا دیا جائے۔ بلکہ اس لیئے بھیجا تھا۔ کہ وہ دین باطل پر غالب آ سکے۔

اقامتِ دین کا مثالی نمونہ

اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالٰی علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔
اس مثالی نمونے کے لیئے خلافت راشدہ، خلافت علی منہاج النبوۃ، حکومت الٰہی اور اسلامی حکومت کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے حکومت قائم کی تھی اس میں بغیر کسی تفریق و تقسیم کے پورے دین اسلام کی مخلصانہ پیروی کی جاتی تھی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کر دیا گیا تھا کہ فرد کا ارتقاء معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل ٹھیک ٹھیک اسی دین کے مطابق تھی۔ اس مملکت میں جاکر ہر شخص اپنی کھلی آنکھوں سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ اسلامی حکومت اور قرآنی معاشرہ کیسا ہوتا ہے اور اقامت دین کا مفہوم کیا ہے جس طرح ایک کھڑے ہوئے شخص کے قد و قامت جسمانی ساخت رنگ روپ اور چہرے مہرے کو پہچاننے کے لیئے دیکھنے والی دو آنکھیں کافی ہیں۔ اسی طرح اقامت دین کا صحیح

مفہوم جاننے کے لیئے صدیقؓ و فاروقؓ کی خلافت کا مثالی نمونہ کافی ہے جس کی بلند قامتی اور اس کے تمام رنگ روپ تاریخ کے صفحات نے محفوظ کر لیے ہیں۔ یہ مثالی نمونہ صرف نمونہ ہی نہیں ہے بلکہ فریضۂ اقامت دین کی ایک زبردست دلیل بھی ہے۔

انحطاط کا اثر

صدیوں کے انحطاط و زوال کا اثر یہ ہے کہ آج پڑھے لکھے مسلمان بھی عام طور سے امت مسلمہ کے مقصد وجود، مقصد حیات، نصب العین اور جدوجہد کے مرکز و محور سے ناواقف ہو گئے ہیں وہ نہیں جانتے کہ اس کا مقصد وجود اور نصب العین کیا ہے اور کس چیز کو اس کی جدوجہد کا مرکز و محور ہونا چاہیئے۔ اس ناواقفیت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغوں میں دین کا ایک بہت ہی محدود مفہوم اور انبیاء کرام علیہم السلام کے مقصد بعثت کا ایک مختصر جزو، کل دین بنا کر اتار دیا گیا ہے۔ وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، مجالس وعظ و نصیحت اور خوش اخلاقی و نیک چلنی کی ٹھنڈی تبلیغ ہی کو پورا دین سمجھتے ہیں اور اس سے آگے کچھ سوچنے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ ان میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو رہے ہیں جن کو اس بات کی کوئی شرعی دلیل ہی نہیں ملتی کہ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد اقامت دین تھا اور نہ انہیں اس بات کی کوئی دلیل ملتی ہے کہ اقامت دین کا مفہوم وہ ہے جس کی تشریح اوپر کی گئی ہے۔

یہ اللہ تعالےٰ کا سب سے بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنی آخری کتاب، آخری نبی کی سیرت اور ان کے ساتھیوں کی تاریخ محفوظ کر دی ہے اور اس کا بھی انتظام فرما دیا ہے کہ قیامت تک ایک جماعت دین حق پر قائم رہ کر اس کی تقویت و اشاعت

اور تجدید و اقامت کا فریضہ انجام دیتی رہے گی اس لیے اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ تعصبات سے ہٹ کر کھلے ذہن کے ساتھ کتاب و سنت اور تاریخ و سیرت کا مطالعہ کرے تو حق اس پر واضح ہو جائے گا۔

رسولوں کی بعثت کا مقصد کیا تھا؟

اس سلسلے میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے رسول کس مقصد سے بھیجے تھے۔ آیا غرض صرف اتنی تھی کہ گمراہ انسانوں تک دینِ حق کا پیغام پہنچا دیا جائے، وہ اسے قبول کرلیں تو بہت اچھا اور نہ قبول کریں تو بس انہیں عذابِ آخرت کی وعید سنادی جائے۔ باقی رہی یہ دنیا تو یہاں ان سے نہ کشمکش کی ضرورت، نہ جنگ کی حاجت، نہ باطل کی شکست مقصود، نہ باطل پرستوں کی ہلاکت منظور۔

رسولوں کو بھیجنے کی غایت یہ تھی کہ گمراہ انسانوں سے دینِ حق کو قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں، اپنی بغاوت و سرکشی پر جمے رہیں تو انہیں شکست دے کر ہلاک کر کے دینِ حق کو سربلند اور دینِ باطل کو نگوں سار کر دیا جائے ۔ ہمارے نزدیک اسی بنیادی سوال کی دوسری شق ہی صحیح ہے۔ ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ انبیائے کرام کو مبعوث کرنے کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ وہ خود مشرکانہ نظام کے تحت زندگی بسر کرتے رہیں یا اس نظام کے تحت زندگی گزارنے والی ایک ایسی جماعت تیار کر دیں جو بتوں کے بجائے صرف خدا کو سجدے کرنے کا حق رکھتی ہو، بلکہ اللہ انہیں اس لیے بھیجتا رہا ہے کہ دینِ شرک مغلوب اور دینِ توحید غالب ہو۔ ایک ایسی آزاد فضا اور

ایک ایسا پاکیزہ ماحول مہیا ہو جس میں دینِ حق کی مکمل پیروی کی جا سکے اور اس پیروی میں کوئی طاقت مزاحم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے کفر و شرک کی طاقت کے مقابلے میں اپنے رسولوں کو جب بھی بھیجا ہے اپنی مدد کا وعدہ کر کے بھیجا ہے اور کشمکش حق و باطل کے ہر نازک موڑ پر تسلی دے کر ان کے حوصلوں کو برقرار رکھا ہے۔

کتاب اللہ کی آیات سے استدلال

چار قسم کی آیات ہمارے اس دعوے پر پورا قرآن گواہ ہے لیکن تمام آیتوں کا استقصاء ایک طویل کام ہے اس لیے ہم اختصار کے ساتھ چار قسم کی آیات سے چند دلائل یہاں پیش کریں گے:

(۱) وہ آیتیں جن میں عمومی طور پر تمام رسولوں سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ہم تمہیں کفار پر غالب کریں گے۔

(۲) وہ آیتیں جن میں مخصوص طور سے حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام سے وعدہ کیا گیا ہے۔

(۳) وہ آیتیں جن میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(۴) وہ آیتیں جن میں امت مسلمہ سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

پہلی دلیل وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ

اور اپنے بندوں یعنی رسولوں کے حق میں ہمارا فیصلہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے۔ بلاشبہ وہی وہ

اَلْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت ر ۵)

لوگ ہیں جن کی مدد کی جائے گی اور بلاشبہ ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا۔

یہ آیتیں کئی حقیقتوں کی واضح نشان دہی کر رہی ہیں:

(ا) تمام رسولوں سے یہ اللہ تعالیٰ کا غیر متبدل وعدہ اور اس کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ وہ باطل پرست طاقتوں کے مقابلے میں ان کی مدد کرے گا۔

(ب) رسولوں اور ان پر ایمان لانے والے داعیانِ حق کی حیثیت ایسے واعظوں کی نہیں ہوتی جن کا کام وعظ کہنے پر ختم ہو جاتا ہے، بلکہ ان کی حیثیت فرماں روائے کائنات کے لشکر کی ہوتی ہے۔ تو اس کے باغیوں کے خلاف صف آرا ہوتا ہے۔

(ج) رسول جس دین اور جس پیغام کی تبلیغ پر مامور ہوتے ہیں اس کی حیثیت کسی ایسی تبلیغ، بیشتر سفارش اور نصیحت کی نہیں ہوتی جسے رد کر دینے کے بعد اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے بلکہ ایک ایسے فرمان شاہی کی ہوتی ہے جس کے انکار کو بادشاہ اپنے خلاف بغاوت اور چیلنج سمجھتا ہے۔

(د) باغی لشکر کے مقابلے میں آخر کار بادشاہ کی وفادار فوج ہی غالب کہیاب اور فاتح ہوتی ہے۔

سے

دوسری دلیل

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (المجادلہ ر ۳)

اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ یقیناً میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ قوی اور زبردست ہے۔

2 37 44

اس آیت میں بھی تمام رسولوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ غالب ہوں گے بلکہ اس میں صراحت کے ساتھ اللہ نے اپنے آپ کو بھی باطل پرستوں کے مقابلے میں ایک فریق کی حیثیت سے ظاہر فرمایا ہے۔ یہ رسولوں اور ان کے ماننے والوں کے لیے اتنی بڑی بشارت ہے جو ان کے حوصلوں کو ناقابل شکست بنا دیتی ہے۔

تیسری دلیل

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝	اور آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہماری ملت میں پلٹ آؤ تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے اور یہ (وعدہ) اس کے لیے ہے جو میرے حضور میں (جوابدہی کے لیے) کھڑے ہونے اور میری وعید سے ڈرے۔
(ابراہیم ۱۳)	

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ خدا کے باغی جب اپنے وقت کے رسولوں کو جلاوطن کرنے کی دھمکی دیتے تھے تو اس نازک وقت میں خدا اپنے وعدے کی تجدید فرماتا اور اپنے رسولوں سے کہتا کہ گھبراؤ نہیں، عنقریب یہ دھمکی دینے والے اپنے ملک سے نیست و نابود ہو جائیں گے اور اپنی زمین میں ہم تمہیں آباد کریں گے اور تم ہی اس کے وارث

ہو گئے۔ آیت کا آخری ٹکڑا بتاتا ہے کہ خدا کی نصرت و حمایت اور وراثت زمین بنانے کا یہ وعدہ ہر اس گروہ کے لیے ہے جو آخرت کی باز پرس اور عذاب الٰہی سے ڈرتا ہوا اور اس طرح زندگی بسر کرے جس طرح اللہ کے رسولوں نے اپنی زندگیاں بسر کیں۔

چوتھی دلیل جب فراعین مصر کی بغاوت و سرکشی اور بنی اسرائیل کا ظلم حد سے تجاوز کر گیا تو ارادۂ الٰہی میں جنبش پیدا ہوئی اور وہ ارادہ کیا تھا اسے خود فرماں روائے کائنات کے الفاظ میں دیکھیے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی	فرعون ملک مصر میں بہت بڑھ
الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا	چڑھ رہا تھا اور اس نے وہاں لوگوں
شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً	کے الگ الگ گروہ قرار دیئے
مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ	تھے۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی
وَيَسْتَحْيِیْ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ	اسرائیل) کو اس نے اس قدر کمزور
كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝	سمجھ رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو
وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى	ذبح کرا دیتا اور ان کی عورتوں
الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا	(بیٹیوں) کو زندہ رکھتا۔ بلا شبہ
فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ	وہ فسادیوں میں سے ایک فسادی
اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ	تھا اور ہم نے ارادہ کیا کہ جو لوگ
الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ	اس ملک میں کمزور سمجھ لیے گئے تھے
لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ	ان پر احسان کریں اور انہیں سردار و
فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ	پیشوا بنائیں اور انہیں (سلطنت)

وَجُنُوْدَهُمَا مَا مَا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ۔ (القصص ر ۱)

کا) وارث بنا دیں اور زمین میں ان کے اقتدار کو جما دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو بنی اسرائیل کی طرف سے جس بات کا خطرہ تھا وہ بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ان کے سامنے لے آئیں۔

بنی اسرائیل پر احسان کرنا، انہیں امامت و پیشوائی کے منصب پر فائز کرنا، انہیں حکومت و سلطنت کا وارث بنانا، زمین میں ان کے اقتدار کو جما دینا اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو مغلوب کرنا — یہ تھا وہ ارادہ جو سلطانِ کائنات نے کیا۔

اللہ کا یہ ارادہ کس طرح ظہور میں آیا۔ اس کی مفصل روداد آگے کی آیتوں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام کو رسالت و نبوت عطا کر کے انہیں اس مشن کی تکمیل پر مامور فرمایا گیا اور انہی کے ہاتھوں ارادہ الہیٰ ظہور میں آیا۔

ایک طرف فرعون کی جبار و زور آور حکومت تھی اور دوسری طرف مغلوب بنی اسرائیل کی انتہائی بے بسی اور کمزوری تھی۔ ایسی قوم کے دو بے بس افراد کا اس عظیم و جاں گداز مشن پر بھیجا جانا سخت حیرت ناک بلکہ دہشت ناک واقعہ تھا۔ شاید اسی لیے مالک الملک نے اس مشن پر بھیجتے وقت ہی ان دونوں سے جو صریح وعدہ فرمایا اس کے الفاظ بھی پڑھتے چلیے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِآيَاتِنَا أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ ۝ (القصص ۳۵)

فرمایا ہم تمہارے بھائی کو تمہارا قوتِ بازو بنائیں گے اور تم دونوں کو ایسا غلبہ دیں گے کہ فرعون کے لوگ تم تک پہنچ بھی نہ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے تم دونوں اور تمہاری پیروی کرنے والے ہی غالب رہیں گے۔

قرآن کی ان صراحتوں کو پڑھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارونؑ باطل کو مغلوب کر کے حق کو غالب کرنے کے مشن پر مامور نہ تھے اور کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ رسالت و نبوت کے منصب سے حکومت و سلطنت کا تعلق محض ضمنی اور جزوی ہوتا ہے۔ ان آیتوں سے زیادہ واضح اور کس نص صریح کی ضرورت ہے جو یہ بتائے کہ انبیاء کرام کے مقصدِ بعثت میں غلبہ حق اور حکومت و اقتدار کا حصول بھی داخل رہا ہے۔ کیونکہ حکومت کے بغیر دین حق کی کامل پیروی ممکن ہی نہیں ہے۔

پانچویں دلیل

مکے میں دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دور ہی میں یہ پُر جلال شاہی اعلان سنا دیا گیا تھا۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝ (القمر: ۴۵)

عنقریب ان کا جتھا شکست کھا جائے گا، اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مکے میں دعوتِ اسلامی کا رنگ کچھ اور تھا اور مدینہ پہنچ کر

اس کا رنگ اچانک بالکل بدل گیا۔ مکے میں آخری نبی نے اپنے آپکو اور اپنے ماننے والوں کو بس ایک دبے ہوئے گروہ کی شکل میں پیش کیا تھا اور مدینہ پہنچ کر انہوں نے یکایک تلوار سونت لی۔ معلوم نہیں یہ چھوٹی سی آیت ان کی نگاہ سے گزری ہے یا نہیں۔ اس آیت نے ابتدا ہی میں مخاطبین قرآن پر یہ حقیقت واضح کردی تھی کہ اسلام کی جو دعوت پیش کی جارہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ نہ مسلمانوں کو اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی تھی اور نہ کفار و مشرکین کو۔ مسلمان بھی خوب جانتے تھے کہ دین حق کو غالب کرنے کے لیے جہاد بالسیف کا مرحلہ آکر رہے گا اور کفار بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ دعوت اسلامی ان کے تحت اقتدار کو الٹ دینے والی ہے۔

چھٹی دلیل

أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ۝ (انبیاء ۴۴)

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں پھر کیا وہی غالب رہیں گے؟

اس آیت میں مشرکوں سے کہا گیا ہے کیا وہ دیکھتے نہیں کہ دین حق کا دائرہ پھیلتا جارہا ہے اور دین باطل کا دائرہ سمٹتا جارہا ہے کیا اس کے بعد بھی ان کے دل کی آنکھیں نہیں کھلتیں؟ کیا [redacted] محسوس نہیں کرتے کہ دعوت حق کے پیچھے کون سی طاقت کام کر رہی ہے کیا وہ اب بھی اسی خام خیالی میں پڑے ہیں کہ حق پرستوں کے مقابلے میں وہی غالب رہیں گے۔ کیا انہوں نے ہمارے رسول کے ڈراوے کو ایک بے اثر اور بے نتیجہ دھمکی سمجھ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس استفہام انکاری نے پوری قوت کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ غالب، محمدؐ واصحابِ محمدؐ ہی ہوں گے اور مغلوبیت ان لوگوں کے حصّے میں آئے گی جو آج حق کے سامنے سینے تان کر چل رہے ہیں۔

ساتویں دلیل

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ٥	بات یہ ہے کہ ہم حق کو (پتھر کی طرح) باطل پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے پھر وہ دیکھتے دیکھتے ملیامیٹ ہو جاتا ہے اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔

(انبیاء ر ۱)

اس آیت نے استعارے کی زبان میں اس حق کی نوعیت واضح کر دی جسے دے کر اللہ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا۔ کفار یہ سمجھتے تھے کہ روئی کا گولا ہے جس کی مار سے ان کے دین کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ نے فرمایا، یہ روئی کا گولا نہیں، بلکہ پتھر کا گولا ہے جو تمہارے دینِ باطل کا سر توڑ کر رکھ دے گا۔ تم بے ہودہ اور لغو باتیں بنا کر خود اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہو۔

آٹھویں دلیل

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا	اور یہ لوگ چاہتے تھے کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر

وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا ○ (بنی اسرائیل ر ۸)

کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔

ہم نے اوپر تیسری دلیل میں سورۂ ابراہیم کی دو آیتیں نقل کر کے دکھایا ہے کہ جب منکرینِ حق اپنے وقت کے رسولؑ کو جلاوطن کرنے کی دھمکی دیتے تھے تو ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ اپنی مدد کے وعدے کی تجدید فرماتا تھا۔ بنی اسرائیل کی اس آیت نے بتایا کہ جب کفار نے حضورؐ کو مکّے سے نکالنے کا ارادہ کیا تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق وعدے کی تجدید فرمائی۔ اس سے ایک طرف تو حضورؐ کی ڈھارس بندھی اور دوسری طرف کفارِ مکّہ کو بھی ہوشیار کیا گیا لیکن اگلوں کی طرح انہوں نے بھی اس دھمکی کی پروا نہ کی اور حضورؐ مکّے سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ کا وعدہ اور وعید کس طرح ظہور میں آئے۔ سورۂ انفال میں آپ کے خلاف کفارِ مکّہ کے مکر کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ ؕ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ ○

وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چالیں چل رہا تھا اور اللہ

کی چال سب سے بڑھ کر ہوتی

ہے۔ (انفال ر۴)

ایک لمبی داستان کو چند الفاظ میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آیت کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ جو یہ بتاتا ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں سے امداد کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ اسے کس طرح پورا کرتا رہا ہے۔

جس طرح پہلے لکھا گیا اس طرح کی تمام آیتیں پیش کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ چند آیتیں بھی پوری وضاحت سے اعلان کر رہی ہیں کہ اللہ تعالٰے ہمیشہ اپنے رسولوں کو اس مقصد سے بھیجتا رہا ہے کہ ان کے ذریعے باطل کو شکست دے اور حق کو غالب کرے۔

اوپر کی آیتوں میں بھی موجود ہے کہ جو وعدہ رسولوں سے کیا گیا ہے وہی ان پر ایمان لانے والوں سے بھی کیا گیا ہے لیکن مزید وضاحت کے لیے چند ایسی آیات بھی پیش کی جا رہی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ ایمان لانے والوں کا ذکر ہے یا جن میں اصل مخاطب مومن گروہ ہی ہے۔

نویں دلیل

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (المومن ر۶)	بلاشبہ ہم اپنے رسولوں اور مومنوں کی مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور مدد کریں گے جس دن گواہ کھڑے ہوں گے (یعنی قیامت کے دن)

دنیا کی زندگی میں رسولوں اور مومنوں سے جس مدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا ذکر اوپر کی آیتوں میں گزر چکا اور اس مدد کی تفصیلات سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ حزب الشیطان کے مقابلے میں حزب اللہ کو کامیاب کرنا۔ یہ ہے ان تفصیلات کا خلاصہ اور اس کی مدد کی نوعیت کا بیان آگے کی آیتوں میں بھی آ رہا ہے۔

دسویں دلیل

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تمہی سربلند رہو گے، اگر مومن ہو۔

(آل عمران ۱۴)

اس آیت نے وعدۂ نصر کی نوعیت یہ بتائی کہ اللہ مومنوں (اگر وہ سچے ہوں) کو سربلند اور کافروں کو نگوں سار کرے گا۔

گیارہویں دلیل

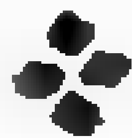
وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

اور جو اللہ کے رسول اور مومنوں کی رفاقت اختیار کرے گا تو اسے معلوم ہو کہ اللہ ہی کی جماعت غالب ہونے والی ہے۔

اس آیت کا اسلوب بیان قابلِ غور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی جماعت تو بنی ہی اس لیے ہے کہ وہ غالب ہو۔ آگے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ

رسول اور مومنوں کو اپنا دوست بنائیں اور ان کی رفاقت اختیار کریں، غلبہ انہیں بھی حاصل ہو گا۔

حق و باطل کی کشمکش میں جو لوگ باطل کے ظاہری زور و قوت کو دیکھ کر کفار و مشرکین سے دوستی کے پینگ بڑھاتے، یہود و نصاریٰ کی طرف مائل ہوتے، یا نفاق و ارتداد کی روش اختیار کرتے ہیں وہ سخت احمق ہیں اگر وہ غلبہ اور عزت و قوت چاہتے ہیں تو انہیں حزب اللہ کا ساتھ دینا چاہیئے کیونکہ حقیقی غلبہ و عزت اسی گروہ کے لیے مقدر ہے۔



غلبہ اور اقتدار کس لئے

اس سوال کا جواب باطل پرستوں کو مغلوب و نگوں سار کرنے اور حق پرستوں کو غالب و سربلند کرنے کی غرض کیا ہے اور کس لیے انہیں غلبہ اور اقتدار بخشا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے ؛

حق پرستوں کو غلبہ اور اقتدار اس لیے بخشا جاتا ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا دین خود ساختہ ادیان پر غالب اور اسی کا نازل کیا ہوا قانونِ حیات نافذ و رائج ہو۔

انبیاء کرام کے مقصدِ بعثت کی جو بحث اوپر گزری اس میں یہ سوال و جواب اشارۃً و اجمالاً موجود ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہاں صراحۃً و تفصیلاً بھی کچھ عرض کریں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر مقصدِ بعثت کی بحث مکمل نہیں ہو سکتی۔ پہلے چند آیتیں پیش کی جا رہی ہیں؛

دو آیتیں سورۂ بقرہ رکوع ۲۶ آیت ۲۱۳ اور ۲۱۴ سامنے رکھیے۔ ہم ان دو آیتوں کا صرف ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

ابتداء میں تمام انسان ایک ہی دین و ملت پر تھے پھر ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ تب اللہ نے اپنے نبی بھیجے جو بشارت اور ڈراوا سنانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں ان کے

درمیان جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لائے انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اللہ جسے چاہتا ہے۔ راہ راست دکھا دیتا ہے۔ (۲۱۳)

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے (۲۱۴)

یہ دو آیتیں ہمارے سامنے صرف انبیاء علیہم السلام کے مقصد بعثت ہی کو واضح نہیں کرتیں بلکہ دین حق جس جاں کاہ و جاں گسل مرحلوں سے گزر کر قائم و غالب ہوتا ہے اس کا بھی نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان دو آیتوں سے مندرجہ ذیل چار باتیں لوضاحت معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) دنیا میں بنی نوع انسان نے اپنا سفر حیات حق کی روشنی میں شروع کیا تھا حق کا علم پا لینے کی وجہ سے انسانی گروہ عرصہ دراز تک ایک ملت اور ایک ہی امت

بنا رہا پھر ایسا ہوا کہ کچھ خود غرضوں کی نفسانیت، ایک دوسرے پر زیادتی اور ذاتی مفاد کے جھگڑوں نے وحدت ملت کو پارہ پارہ کر دیا اور دین حق میں اختلافات پیدا کر دیے لیکن اللہ چونکہ رحمٰن و رحیم ہے اس لیے اس نے انسانوں کو تباہ برباد ہونے کے لیے بے سہارا نہ چھوڑا بلکہ ان کی صلاح و فلاح کے لئے اپنے برگزیدہ بندے مبعوث کیے۔

(ب) تمام انبیاء و رسل کے ساتھ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب برحق بھی ہوتی تھی جو عقائد و اعمال کے تمام اختلافات و نزاعات کے لیے قاضی اور حاکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ انبیاء صرف اسی لیے نہیں بھیجے جاتے ہیں، کہ خوشخبری اور ڈراوا سنا دیں بلکہ انہیں کتاب برحق دے کر اس بات پر بھی مامور کیا جاتا تھا کہ وہ تمام اختلافات کو مٹا کر لوگوں کو پھر اسی دین حق پر جمع کریں جس میں اختلاف پیدا کر کے وہ الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ زندگی کا کوئی معاملہ بھی ہو صرف اس کتاب کو یہ حق ہوتا تھا کہ وہ اس کے صحیح یا غلط، حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کرے۔ اللہ کی کتابوں یعنی اس کے نازل کردہ قوانین و شرائع کی حاکمیت اور ان کی حیثیت کی مزید توضیح کے لیے سورہ مائدہ کی آیت ۴۴ تا ۵۰ نیز آیات ۶۶ تا ۶۸ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(ج) سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے بتایا گیا ہے کہ اگلی امتوں نے اپنے وقت کے رسولوں اور خدا کی کتابوں کو اپنا قاضی و حاکم آسانی سے تسلیم نہیں کیا اور یہ راہ پھولوں کی سیج کبھی نہیں رہی ہے۔ یہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ تم سے پہلے کے داعیان حق نے اس راہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں اور دشمنان حق کے ہاتھوں اس طرح ہلا مارے گئے ہیں کہ اہل ایمان کے ساتھ

وقت کے رسول تک چیخ اٹھے ہیں۔ پھر تم کس بنا پر یہ توقع رکھ سکتے ہو کہ جو کچھ تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ وہ تم پر نہیں گزرے گا۔

(د) اللہ کے باغیوں سے کش مکش اور کتاب برحق کی اقامت و تنفیذ کی تمام سعی و جہد کا مقصود دخول جنت کا استحقاق ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کے ٹکڑے سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد میں جان کھپانے والوں کا محرک عمل اور اصل مطمح نظر اللہ کی خوشنودی اور جنت کا حصول ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جنت کا حصول اقامتِ دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا کے نازل کردہ قانون پر لوگوں کو جمع کرنے کی جدوجہد سے دامن کشی کے باوجود رضائے الٰہی اور جنت کے حصول کی توقع صحیح نہیں ہے۔

تیسری آیت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پر
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ	کتاب اور میزان عدل نازل کی تاکہ
وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ	لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں
بِالْقِسْطِ ج وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ	اور ہم نے لوہا اتارا اور اس میں سخت
فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ	جنگ کا سامان ہے اور لوگوں کے لیے
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ	اس میں کچھ فائدے ہیں اور اس
اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ	لیے کہ اللہ جان لے کہ بن دیکھے
بِالْغَيْبِ ط اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ	کون اس کے اور اس کے رسولوں کی
عَزِيْزٌ ○	مدد کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ قوی اور

الحدید (۲۵)　　　　　　زبردست ہے۔

کتاب کے ساتھ میزان نازل کرنے کا ذکر سورۂ شوریٰ آیت ۱۷ میں بھی ہے سورۂ حدید کی اس آیت کا اسلوب ایسا ہے جس نے حضرت انبیاء کے مشن کو واضح کر دیا ہے، بلکہ خاص حالات میں اس مشن کو کامیاب کرنے کے آخری مرحلے اور عام حالات میں اس کو قائم رکھنے کی ضروری تدبیر کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔

پہلے ٹکڑے میں اللہ رب العٰلمین نے فرمایا ہے کہ ہم اپنے رسولوں کو کتاب و میزان کے ساتھ اس لیے بھیجتے رہے ہیں کہ تمام انسان ظلم کی روش ترک کر کے عدل و انصاف کی روش پر قائم ہو جائیں ظالموں کا عدل و انصاف کی روش پر قائم ہو جانا اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اقامت عدل کی سعی کی جائے اس لیے دوسرے ٹکڑے میں جس حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عدل و انصاف پر قائم ہونا اور قائم رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے انتہائی جدوجہد لازمی اور آخری تدبیر کے طور پر قوت کا استعمال بھی ضروری ہے لوہے کی تخلیق کے تین اغراض بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس سے آلات حرب اور سامان جنگ تیار کئے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ آلات حربیہ کے علاوہ اس میں کچھ دوسرے منافع بھی ہیں اور تیسری یہ کہ اللہ تعالےٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کو دیکھے بغیر کون لوگ اس قوت کو اس کے دین اور اس کے رسولوں کی مدد میں صرف کرتے ہیں

عدل کے قیام و بقا کے لیے اقتدار ضروری ہے

اس آیت سے بھی بصراحت معلوم ہوا کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد دنیا سے ظلم و جور کا استیصال اور عدل و انصاف کا قیام رہا ہے اور عدل و انصاف قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے سلطان قائم بالسیف (اقتدار

جو بزور طاقت ظلم کی بیخ کنی کرتا ہے) کا وجود ضروری ہے۔

کیا اقامت دین کا نصب العین اس کے سوا کوئی اور مفہوم رکھتا ہے؟ کیا اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اللہ کے دین کی مدد کر کے اس کو ادیان باطلہ پر غالب کرنا بعثت انبیاءؑ کا مقصد تھا؟ اور دین حق کو غالب کرنے کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ اللہ کا بھیجا ہوا نظام عدل قائم اور اس کے قوانین نافذ ہوں اور اس کی مکمل پیروی کی راہ میں کوئی مزاحم طاقت باقی نہ رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن سمجھ کر پڑھنے کے باوجود کوئی مسلمان دین کے جامد اور محدود نقطۂ نظر پر کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

اس آیت کے آخر میں ان اللّٰہ قوی عزیز فرما کر مجاہدین حق کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس نے تمہیں جہاد کا حکم دے کر اور اپنے دین کی امداد کا شرف عطا کر کے تم پر احسان کیا ہے اور تمہارے لئے مراتب عالیہ کا دروازہ کھولا ہے ورنہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی قدرت قاہرہ سے کتنی ہی سرکش قوموں کو ہلاک کر کے اپنے وفادار بندوں کو غلبہ عطا کیا ہے:۔

مفسر ابن کثیر کی ایک عبارت

کتاب برحق کی تنفیذ انبیاء کرامؑ علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں کے لئے کیا اہمیت رکھتی ہے اس کی مزید توضیح و توثیق کے لئے میں نے آغاز میں سورۂ مائدہ کے رکوع سات کی طرف متوجہ کیا تھا جس میں کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو کافر ظالم اور فاسق کہا گیا ہے پھر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ رکوع ذیل کی آیت پر ختم ہوا ہے:۔

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۝ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝ (مائدہ)

کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں اللہ سے بہتر حکم کس کا ہے۔

اس آیت کے تحت مفسر ابن کثیرؒ نے یہ چونکا دینے والی عبارت لکھی ہے :

ينكر تعالى على من خرج عن حكم الله المحكم المشتمل على كل خير الناهي عن كل شر وعدل الى ما سواه من الآراء والاهواء والاصطلاحات التي وضعها الرجال بلا مستند من شريعة الله كما كان اهل الجاهلية يحكمون به من الضلالات والجهالات مما يضعونها بآرائهم واهوائهم وكما يحكم به التتار

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان لوگوں پر انکار کر رہا ہے جو اللہ کے اس محکم فیصلہ و قانون سے الگ ہو جائیں جو ہر خیر پر مشتمل اور ہر شر سے روکنے والا ہے اور اس کے بدلے میں لوگوں کی اپنی خواہشات آرا اور اصطلاحات اختیار کر لیں جن کی اللہ کی شریعت میں کوئی سند اور دلیل موجود نہ ہو جس طرح اہل جاہلیت اپنی خواہشات اور آراء سے گھڑی ہوئی گمراہیوں اور جہالتوں کے مطابق زندگی کے معاملات کے فیصلے کیا کرتے تھے اور جس طرح تاتاری اپنی ملکی سیاستوں کے مطابق فیصلے کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے بادشاہ چنگیز خان سے اخذ کیے ہیں جس نے ان کے لیے یاسق

من السياسات
المدنية المأخوذة عن
ملكهم جنكزخان
الذي وضع لهم الياسق
وهو عبارة عن كتاب
مجموع من احكام قد
اقتبسها عن شرائع شتى
من اليهودية والنصرانية
والملة الاسلامية وغيرها
وفيها كثير من الاحكام
اخذها من مجرد نظره
وهواه فصارت في بنيه
شرعا متبعا يقدمونها
على الحكم بكتاب الله و
سنة رسول الله صلى
الله عليه وسلم فمن فعل
ذالك فهو كافر يجب قتاله
حتى يرجع الى حكم الله ورسوله
فلا يحكم سواه في قليل ولا كثير

تیار کیا تھا اور وہ عبارت ہے اس
مجموعۂ احکام سے جس میں یہودی
نصرانی اسلامی اور دوسری
شریعتوں سے احکام لیے گئے
ہیں اور اس میں بہت سے احکام
ایسے ہیں جو صرف چنگیز خاں کے غور و
فکر اور اس کی خواہشات کا نتیجہ
ہیں یہ مجموعہ احکام اب اس کے خاندان
کے مسلمان سلاطین و حکام کے نزدیک
وہ اصل شریعت ہے جس کا وہ اتباع
کرتے ہیں۔ اس مجموعہ کے احکام کو
کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ
کے احکام پر مقدم رکھتے ہیں۔ اور جو
ایسا کرے وہ کافر ہے۔ اس سے
اس وقت تک مقاتلہ واجب ہے
جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول
کے حکم کی طرف پلٹ نہ آئے اور چھوٹے
بڑے معاملے میں انہیں کے مطابق
فیصلے نہ کرنے لگے۔

جو لوگ دینِ اسلام کے سیاسی پہلو کو اس کا ایک حقیر اور ضمنی جزو سمجھتے ہیں انہیں قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ آیتیں تو دینِ اسلام کے سیاسی پہلو کو کفر و اسلام کی کسوٹی قرار دے رہی ہیں۔ اس حقیقت کے مطالعہ کے لیے سورۂ مائدہ کا رکوع سات اور اس کا سیاق و سباق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بعثت محمدی کا مقصد

هُوَ الَّذِیْ	وہی ہے جس نے اپنے رسول کو
اَرْسَلَ	ہدایت اور دینِ حق دے کر
رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ	بھیجا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر
لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ	غالب کرے اور (اس حقیقت پر)
كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (الفتح ۲۸)	اللہ کی گواہی کافی ہے۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ حدید کی آیتوں نے بالعموم تمام انبیاء کرام کے مقصدِ بعثت کو واضح کیا اور سورۂ فتح کی اس آیت نے بالخصوص خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت بعثت صریح الفاظ میں ہمیں بتائی ہے اور ٹھیک یہی غرض و غایت سورۂ توبہ آیت ۳۲ اور سورۂ صف آیت ۹ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

یہ بات دوسرے اسلوبِ بیان میں سورۂ انبیاء کی آیت ۱۸ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ اور سورۂ السبا کی آیت ۴۹ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۱ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا میں بتائی گئی تھی۔ ٹھیک وہی بات التوبہ، الفتح اور الصف کی آیتوں میں اس صراحت کے ساتھ دہرائی گئی ہے کہ بعثت محمدی کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ دینِ حق کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کر دیا جائے۔

آیت الفتح کے آخری ٹکڑے وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا نے واضح کیا کہ بعثتِ محمدی کی اس غرض وغایت پر اللہ کی گواہی کافی ہے کیونکہ ان کو رسول بنا کر اسی نے بھیجا ہے اور وہی جانتا ہے کہ انہیں بھیجنے کی غرض وغایت کیا ہے۔ اب اگر تمام دنیا مل کر بھی یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ نہیں تھا تو اس کی بات قابلِ سماعت نہ ہوگی۔

اقامت دین کا حکم

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔

مقرر کرد برائے شما از آئین آنچہ امر کردہ بود باقامت آں نوح را وآنچہ وحی فرستادیم بسوئے تو وآنچہ امر کردیم باقامت آں ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ بایں مضمون کہ قائم کنید دین را ومتفرق مشوید دراں

فارسی کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے۔ اس فارسی کا اردو ترجمہ یہ ہے:

تمہارے لیے وہ آئین مقرر کیا جس کی اقامت کا حکم دیا تھا۔ نوحؑ کو اور جس کے لیے ہم نے وحی بھیجی ہے۔ تمہاری طرف اور جس کی اقامت کا ہم نے حکم دیا ابراہیم اور موسےٰ اور عیسیٰ کو بایں مضمون کہ قائم کرو دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو۔

اس آیت نے غلبہ دین کی تمام تعبیرات وتفصیلات کو "اقامتِ دین" کی ایک جامع اصطلاح میں اکٹھا کر دیا ہے۔ یہ چونکہ ایک مختصر اور جامع اصطلاح ہے

اس لیئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک تمام علمائے امت دین اسلام کی ترویج وتنفیذ کے لیئے یہی اصطلاح استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔

اس آیت نے چند بہت بڑے درجے کے انبیاء ورسل کے نام لے کر یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ سب کے سب اس لیئے بھیجے گئے تھے کہ اللہ کا بھیجا ہوا دین قائم کریں۔ اقامت دین ہی ان سب کا مقصد تھا۔ تمام انبیاء سے مدد کا وعدہ اللہ کے باغیوں کی شکست اور مغلوبیت اور وفاداران حق کی غالبیت و فتح کی غرض اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اللہ کا دین قائم اور غالب ہو۔ یہی وہ مقصد تھا۔ جس کے لیئے انبیاء کرام بھیجے جاتے رہے اور جن کا سلسلہ سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔

ایک شبہے کا ازالہ

اگر کوئی سوال کرے کہ سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں "الدین" سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے صرف اصول دین مراد ہیں یا اصول دین کے ساتھ شریعتیں بھی مراد ہیں اگر صرف اصول دین مراد ہیں تو اس سے مکمل دین اسلام کی اقامت کا حکم کیسے اخذ کیا جاسکتا ہے اور اگر شریعتیں بھی مراد ہیں تو اشکال پیش آتا ہے کہ جب شریعتیں مختلف رہی ہیں تو پھر آیت میں مذکور تمام انبیاء کو ایک ہی شریعت کی اقامت کا حکم دینا کس طرح صحیح ہوگا؟

اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ آیت میں یہ شبہہ پیدا کیا جاسکتا ہے پیدا ہوتا نہیں ہے اس لیئے کہ اس آیت میں اللہ تعالےٰ یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے نوح، محمدؐ

ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو یہ حکم دیا کہ دین قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔
یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہر نبی کو اسی دین کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے جو اس پر
نازل ہوا۔ اللہ کا فرشتہ ہر ایک پر الگ الگ وحی لایا۔ الگ الگ کتابیں نازل
ہوئیں۔ الگ الگ ہدایتیں اور پیغامات بھیجے گئے۔ ایسا نہیں ہوا ہے کہ صرف
ایک کتاب نازل ہوئی ہو اور ہر نبی کے ہاتھ میں وہی کتاب دے دی گئی ہو۔

اوپر قرآن کی آیتیں پیش کر کے تھوڑی تفصیل سے یہ واضح کیا جا چکا
ہے کہ ہر رسول پر کتاب برحق اور میزان عدل اس لیے نازل کی گئی تھی کہ لوگ عدل و
انصاف کی روش پر قائم ہوں اور ان کے درمیان تمام من گھڑت اختلافات
ختم کر دیے جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کتاب برحق میں کیا صرف اصول
دین ہوتے تھے شریعت نہیں ہوتی تھی؟ کیا وہ کتاب تمام انفرادی و اجتماعی
احکام پر مشتمل نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کو صرف عقائد نماز روزہ زکوٰۃ اور اخلاق حسنہ
کے بیان پر ختم کر دیا جاتا تھا؟ مثال کے طور پر کیا توریت میں اجتماعی زندگی کے
احکام و قوانین نہیں بیان کیے گئے ہیں کیا کوئی پڑھا لکھا آدمی اس طرح کی بات
سوچ بھی سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر نبی اس مجموعہ احکام کی اقامت کا مکلف ہوتا
تھا جو اس پر نازل کیے جاتے تھے اور اسی مجموعہ احکام کو دین کہتے ہیں شریعت
دین سے کوئی الگ چیز نہیں ہوتی بلکہ اس میں داخل اور اس کا جز ہوتی ہے پھر
یہ بات کس منطق سے صحیح ہوگی کہ کل کی اقامت کا حکم دیا جائے اور جز اس سے خارج ہو۔

شریعتوں کے اختلاف کی نوعیت

شریعتوں کے اختلاف سے جو اشکال

پیش آتا ہے اس کو حل کرنے کے لئے یہ جاننا چاہیے کہ انبیاء کرام کی شریعتوں میں اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔ اس علم کے بعد یہ اشکال رفع ہو جائے گا۔

بات یہ ہے کہ شریعتوں کے درمیان کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف کبھی نہیں رہا ہے بلکہ محض جزوی و فرعی اختلافات رہے ہیں۔ جہاں تک ایسے احکام و امور کا تعلق ہے جو انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو درست کرنے کے لیے ضروری ہیں وہ تمام شریعتوں میں موجود رہے ہیں کوئی ایک شریعت بھی ان سے خالی نہیں رہی ہے اور ایسے تمام احکام اصل دین میں داخل ہوتے تھے اس سے خارج نہیں ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر نماز ہر شریعت میں فرض رہی ہے۔ لیکن اس کے اوقات ارکان اور ہیئتوں میں فرق رہا ہے روزہ ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔ لیکن پورے ماہ رمضان کا روزہ شریعت محمدی میں فرض ہوا ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان اقامت عدل، مظلوموں کی دادرسی، مجرموں کی تعزیر، منکرین حق سے جہاد تمام شریعتوں کے جزوی اجزاء رہے ہیں لیکن ان کے ضابطوں اور تفصیلات میں جزوی اختلافات رہے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دینی احکام کے انہیں جزوی اختلافات کے لحاظ سے شریعتوں کے درمیان امتیاز قائم ہے اور وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانی جاتی ہیں۔ مثلاً شریعت محمدی شریعت موسوی سے الگ ایک مستقل بالذات شریعت ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ یہاں دین سے شرائع مراد نہیں ہیں تو اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ دینی احکام کی تفصیلات اور جزوی اختلافات مراد

نہیں ہیں، کیونکہ ہر نبی کو اپنے وقت کے لحاظ سے تشریعی احکام جزوی اختلافات کے ساتھ دیئے جاتے ہیں۔ یہ مراد نہیں ہے کہ "الدین" سے نفس شریعت ہی خارج ہے۔ دین سے واقف کوئی شخص اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔ مفسرین کی تفسیر کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر پچھلے نبی کو اگلے نبی کے ان مخصوص جزوی احکام و شرائع کی اقامت کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ جو اس پر نازل ہوئے اس لئے کہ پچھلے نبی پر وقت کے لحاظ سے مخصوص جزوی احکام الگ نازل ہوتے تھے، اور وہ انہیں کی اقامت کا مکلف ہوتا تھا، چنانچہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس شریعت کی اقامت کے مکلف ہیں جو آپ پر نازل ہوئی۔

چھٹی آیت

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج: ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت سے پہلے کی تین آیتیں ۳۸ تا ۴۰ بھی سامنے رہنی چاہئیں۔ میں یہاں صرف ان کے ترجمے نقل کر رہا ہوں۔

یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لاتے ہیں۔ یقیناً اللہ کسی خائن، کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا (۳۸) اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور

اللہ یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے۔ (۳۹) یہ وہ لوگ ہیں جو گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے ہیں اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جاتیں، اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ (۴۰)

ان تین آیتوں میں اہل حق کی طرف سے مدافعت اور ان کی مدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو قتال کی اجازت دی گئی ہے اور اللہ نے اپنی یہ قدیم سنت بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ ہمیشہ اہل حق کو اہل باطل پر غلبہ عطا فرماتا رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو باطل پوری طرح چھا جاتا یہاں تک کہ وہ عبادت گاہیں بھی مسمار کر ڈالی جاتیں جن میں اللہ واحد کا نام لیا جاتا اور اس کا ذکر کیا جاتا ہے اس کے بعد آیت ۴۱ میں اہل حق کو زمین میں سلطنت اور اقتدار بخشنے کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے اس آیت میں خلفائے راشدین کی تعریف بھی ہے اور خلافت راشدہ یا اسلامی حکومت کے مقاصد و فرائض بھی متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی چار کلیات نے اپنے اندر تمام جزئیات کو سمیٹ لیا ہے۔

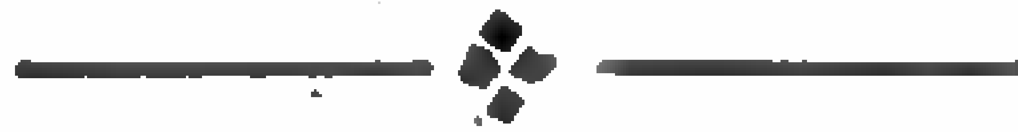
حقیقی اسلامی حکومت مسلمانوں کے جن حکمرانوں نے خلوص کے ساتھ اس آیت کو اپنی حکومت کا نصب العین بنایا ہے انہیں کی حکومت درحقیقت اسلامی حکومت بنی ہے جنھوں نے اس سے غفلت برتی ہے ان کی حکومت خلافت راشدہ سے دور ہو گئی۔

ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے اس آیت کو نہ صرف
یہ کہ اپنے سامنے رکھا، بلکہ اپنے ایک خطبے میں اس کی تفسیر بھی فرمائی:

قال الصباح بن سوادة	صباح بن سوادہ کندی کہتے ہیں
الكندي سمعت عمر بن	کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ
عبد العزيز يخطب وهو	کو خطبہ دیتے ہوئے سنا وہ خطبے
يقول الذين ان مكنّٰهم	میں اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي
في الارض الآية ثم قال	الْاَرْضِ کی پوری آیت پڑھ رہے
الا انها ليست على الوالي	تھے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے
وحده ولكن على الوالي	فرمایا یہ آیت صرف والی و حاکم ہی
والمولى عليه الا انبئكم	پر ذمہ داری نہیں ڈالتی، بلکہ حاکم
بما لكم على الوالي من ذالكم	اور اس کے ماتحت دونوں پر ذمہ داریاں
وبما للوالي عليكم منه ان	عاید کرتی ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ
لكم على الوالي من ذالكم	حاکم پر تمہارا حق کیا ہے اور تم پر
ان يأخذ بحقوق الله عليكم	حاکم کا حق کیا ہے۔ تمہارا حاکم پر
وان يأخذ بعضكم	حق یہ ہے کہ وہ تم سے اللہ کے
من بعض وان يهديكم	حقوق وصول کرے اور تم میں سے
للتي هي اقوم ما استطاع	بعض کا حق جو دوسرے پر ہے
وان عليكم من ذالك	بھی وصول کرے اور بحد استطاعت سیدھی
الطاعة غير المبزوزة	راہ کی طرف راہنمائی کرے اور تم پر

ولا المستکرہ بہا	حاکم کا حق یہ ہے کہ تم اس کی ایسی
ولا المخالف سرّھا	اطاعت کرو جو خوش دلی سے ہو
علانیتہا ۔	نہ تو وہ کراہت وجبر کے ساتھ ہو
(ابن کثیر جلد ۲)	اور نہ منافقانہ ہو ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو جو اقتدار بخشتا ہے اس کی غرض و غایت اقامت عدل و اقامت دین کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی یہ بات بھی پوری طرح واضح ہو گئی کہ غلبہ و اقتدار اور اقامت دین کے درمیان موقوف اور موقوف علیہ کے سوا دوسری کوئی نسبت نہیں پائی جاتی ۔ اسلامی حکومت کے بغیر خدا کا اتارا ہوا دین بہ تمام و کمال قائم ہی نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے اس موقوف علیہ کو حاصل کرنا ضروری ہے ۔ اسی کی تحصیل کے لیے اللہ نے اپنی قوتِ قاہرہ سے منکرینِ حق کو پامال کیا ہے اور کبھی اپنے وفاداروں کو جہاد کا حکم دے کر ان کی مدد فرمائی ہے اور منکرینِ حق کے مقابلے میں انہیں سربلند کیا ہے ۔



اقامتِ دین احادیث میں

پہلی حدیث

(۱) پہلی حدیث جو میں یہاں نقل کر رہا ہے، اس کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں دو جگہ روایت کیا ہے۔ کتاب التفسیر اور کتاب البیوع میں صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث انہوں نے الادب المفرد باب الانبساط الی الناس میں بھی روایت کی ہے۔ امام احمد اور امام طبرانی نے بھی یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کی ہے۔ امام احمد اور امام طبرانی نے عبداللہ ابن سلام سے اس کو روایت کیا ہے۔ میں یہ الفاظ کتاب التفسیر سے نقل کر رہا ہوں اور ترجمہ وہ نقل کر رہا ہوں جو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبیؐ جلد سوم میں کیا ہے۔

عن عبد اللہ بن عمرو	حضرت عبداللہ ابن عمروؓ نے کہا
ابن العاص رضی اللہ عنہما	قرآن کی یہ آیت کہ اے پیغمبر ہم نے
ان ھذہ الآیۃ التی فی القرآن	تجھکو گواہ اور خوشخبری سنانے والا بنا کر
یا ایھا النبی انا ارسلنک	اور امیوں کا ماوٰی اور ملجا بنا کر بھیجا

شَاهِداً وَّمُبَشِّراً وَّنَذِيراً
قَالَ فِي التَّوْرَاةِ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ
اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِداً وَّ
مُبَشِّراً وَّنَذِيراً وَّحِرْزاً لِّلْاُمِّيِّيْنَ
اَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ
سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ
وَّلَا غَلِيْظٍ وَّلَا سَخَّابٍ فِي
الْاَسْوَاقِ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَةَ
بِالسَّيِّئَةِ وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَ
يَصْفَحُ وَلَنْ يَّقْبِضَهٗ حَتّٰى
يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ
بِاَنْ يَّقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
فَيَفْتَحُ بِهَا اَعْيُنًا عُمْيًا وَّاٰذَانًا
صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا۔

تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے
اور میں نے تیرا نام خدا پر بھروسہ رکھنے
والا رکھا وہ سخت دل اور سنگ دل
نہ ہوگا، اور بازاروں میں شور
نہ کرے گا۔ وہ برائی کے
بدلے برائی نہ کرے گا بلکہ عفو
اور درگزر کرے گا اور اس
وقت تک خدا اس کی رُوح قبض نہ
کریگا جب تک اس کے ذریعے وہ
کج دین کو سیدھا نہ کریگا کہ لوگ کہنے
لگیں کہ وہ ایک خدا ہے اس کے
سوا کوئی نہیں۔ بس وہ اس دین سے
اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور
نافہم دلوں کو کھول دے گا۔

اس حدیث سے بصراحت یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے سینکڑوں سال پہلے توراۃ میں بھی آپ کے مقصد بعثت کے لیے اقامتِ دین ہی کی تعبیر اختیار کی گئی تھی اور اس میں یہ پیشین گوئی اور اللہ کا وعدہ موجود تھا کہ جب تک آپ اپنے مشن کو پورا نہ کرلیں، آپ کی وفات نہ ہوگی - نیز اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اقامت دین کا جو کام آپ کے سپرد ہوا تھا وہ آپ کی بعثت سے لیکر وفات

تک محیط ہے مکے میں آپ نے دعوتِ اسلامی کا جو کام انجام دیا وہ بھی کج دین کو سیدھا کرنے کے لیے تھا اور مدینے آکر آپ نے منکرینِ حق سے جو جہاد بالسیف کیا وہ بھی کج دین کو سیدھا کرنے کے لیے ہی کیا تھا۔ اس طرح یہ حدیث اقامتِ دین کے مفہوم پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اوپر سورہ فتح اور سورہ شوریٰ کی جو آیتیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ حدیث ان آیتوں کی ایک اچھی شرح ہے۔

دوسری حدیث

(۲) امام بخاریؒ نے حضرت معاویہؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے :-

اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قُرَیْشٍ لَا یُعَادِیْھِمْ اَحَدٌ اِلَّا کَبَّھُمُ اللّٰہُ عَلٰی وَجْھِہٖ مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ۔	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ خلافت قریش میں اس وقت تک باقی رہے گی جب تک وہ اقامتِ دین کرتے رہیں گے جو کوئی بھی ان سے دشمنی کرے گا اللہ اس کو منہ کے بل گرا دے گا۔
(باب مناقب قریش)	

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دینِ اسلام کی پیروی اور اس کے احکام و قوانین کی ترویج و تنفیذ کے لیے اقامتِ دین ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اسی کی ہم معنیٰ حدیث حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بھی مروی ہے۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں :-

وقد ورد فی حدیث   حضرت ابوبکر صدیق کی حدیث

ابی بکر الصدیق نظیر	میں بھی اس طرح کی بات کہی گئی ہے
ما وقع فی حدیث معاویۃ	جو حدیث معاویہؓ میں ہے اس کا
ذکرہ محمد بن اسحٰق	ذکر محمد بن اسحٰق نے الکتاب الکبیر میں کیا
فی الکتاب الکبیر فذکر	ہے انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ اور
قصۃ سقیفۃ بنی ساعدۃ	حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا واقعہ لکھا
وبیعۃ ابی بکر وفیہا فقال	ہے اور اسی میں یہ ہے کہ حضرت
ابوبکر وان ھذا الامر	ابوبکر نے فرمایا یہ خلافت قریش میں
فی قریش ما اطاعوا اللّٰہ	اس وقت تک باقی رہے گی جب تک
واستقاموا علی امرہ	وہ اللہ کی اطاعت کرتے اور اس
(فتح الباری، کتاب الاحکام جلد ۱۷)	کے حکم پر جمے رہیں۔

بخاری کی اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ امرائے قریش جب تک اقامتِ دین کرتے رہیں گے خلافت ان کے اندر باقی رہے گی اور ان کا ہر دشمن منہ کی کھائے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر وہ دین کو قائم نہیں رکھیں گے اور اس فریضے سے غفلت برتیں گے تو کمزور ہو جائیں گے اور خلافت ان سے چھن جائیگی۔ یا کم سے کم یہ کہ وہ خلافت کے مستحق باقی نہ رہیں گے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہوا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود امت مسلمہ کو دین اسلام پر قائم رکھنے کا ذریعہ کیا ہے اور یہ امت کس طرح اسلام پر باقی رہے گی اور جب تک اس سوال کا جواب نہ ملے تصویر کا دوسرا رخ واضح نہ ہوگا۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ سوال آج پیدا نہیں ہوا بلکہ حضورؐ کے بعد یہ خلافتِ صدیقی ہی میں پیدا ہوا تھا اور صدیق اکبرؓ

نے اس کا جواب بھی عنایت فرمایا تھا۔ یہ سوال و جواب ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

تیسری حدیث

امام بخاری نے قیس بن ابی حازم سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ قبیلہ احمس کی ایک عورت کے پاس گئے ان کا نام زینب تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ کچھ بولتی نہیں۔ پوچھا یہ کیوں باتیں نہیں کرتی؟ لوگوں نے کہا۔ انھوں نے یہ نذر مانی ہے کہ حج ختم ہونے سے پہلے کسی سے باتیں نہ کریں گی۔ آپ نے زینب سے کہا۔ باتیں کرو اس لیے کہ چپ کا حج جائز نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کا عمل ہے۔ یہ سن کر انھوں نے گفتگو شروع کی۔ پوچھا آپ کون ہیں؟ کہا میں مہاجرین کے گروہ کا ایک فرد ہوں۔ پوچھا۔ مہاجرین کے کس قبیلے سے تعلق ہے؟ کہا قریش سے۔ پوچھا۔ قریش کی کس شاخ سے تعلق ہے؟ آپ نے فرمایا تم تو بہت سوال کرنے والی عورت ہو۔ میں ابوبکرؓ ہوں۔ اس کے بعد جو سوال و جواب ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

قالت ما بقاءنا علی	خاتون نے پوچھا کہ جاہلیت کے
هذا الامر الصالح الذی	بعد یہ جو صالح دین اللہ نے ہمیں عطا
جاءنا به بعد الجاهلية	فرمایا ہے ہم کب تک اسی پر قائم رہیں
قال بقاءکم علیه	گے؟ آپ نے جواب میں فرمایا تم اس
ما استقامت بکم	دین پر اس وقت تک قائم رہو گے
ائمتکم	جب تک تمہارے ائمہ خود اس دین
(بخاری	پر قائم رہیں گے اور تمہیں قائم
جلد ا باب ایام الجاہلیۃ)	رکھیں گے۔

اس سوال و جواب پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے [illegible] یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "ما اقاموا الدین" اور حضرت ابوبکرؓ کے ارشاد "ما استقامت بکم ائمتکم" میں الفاظ کے لحاظ سے تو فرق ضرور ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے جواب سے یہ حقیقت واضح کر دی کہ امامت صالح یا خلافت راشدہ کے بغیر امت مسلمہ اسلام پر باقی نہیں رہ سکتی۔

حافظ ابن حجر کی تشریح: عرب خاتون کے سوال میں "الامر الصالح" کا جو لفظ آیا ہے اس کی تشریح حافظ ابن حجر نے یہ کی ہے:۔

ای دین الاسلام وما اشتمل علیہ من العدل واجتماع الکلمۃ ونصر المظلوم ووضع کل شیئ فی محلہ (فتح جلد ۷)	یعنی امر صالح سے مراد ہے دین اسلام اور یہ دین، عدل و انصاف، وحدت کلمہ، مظلوم کی مدد اور ہر شے کو اپنے مقام و محل پر رکھنے کی جن خوبیوں پر مشتمل ہے وہ سب اس سے مراد ہیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ خاتون نے جو بات پوچھی تھی وہ یہ تھی کہ جاہلیت کے کفر و شرک، انتشار کلمہ اور ہر طرح کے ظلم و جور کے بعد اللہ نے جو دین حق عطا فرمایا ہے اور جو عدل و انصاف، وحدت کلمہ، مظلوم کی مدد اور زندگی کے تمام معاملات میں حسن ترتیب کی خوبیوں پر مشتمل ہے۔ ہم ایک ایسے مکمل دین پر کب تک قائم رہیں گے اور اس پر قائم رہنے کی صورت کیا ہوگی؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے

وہ یہ ہے کہ جب تک حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی جو خود اسلام کے احکام و قوانین پر عمل پیرا ہوں گے اور ساتھ ہی اپنے ماتحت بندگانِ خدا کو ان پر چلاتے رہیں گے۔ تم اس مکمل دین پر قائم رہو گے تمہارا کلمہ ایک ہوگا تم ایک جماعت بنے رہو گے۔ تمہارے معاشرے میں ہر طرف عدل و انصاف کا راج ہوگا اور تمہاری زندگی کی کل سیدھی رہے گی۔ یہ حکومت اسلامیہ یہ امامت صالحہ یہ خلافت راشدہ تمہارے اس مکمل دین پر قائم رہنے کا واحد ذریعہ ہے۔

یہ بات جو انہوں نے فرمائی اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اسلامی اسلام کے بہت سارے اجتماعی احکام کی موقوف علیہ ہے اس کے بغیر ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عوام الناس کا وہی دین ہوتا ہے جو ان کے ملوک و امرا کا دین ہے وہ زندگی کے معاملات میں انہیں کی پیروی کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر کے جواب کی تشریح میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے۔

ای لان الناس علی	یہ اس لیے کہ لوگ اپنے بادشاہوں
دین ملوکهم فمن حاد	کے دین پر ہوتے ہیں تو ائمہ و حکام
من الائمہ عن الحال	میں سے جو کوئی حق کی راہ سے ہٹے گا وہ
مال وامال	باطل کی طرف مائل ہوگا اور دوسروں
(فتح الباری جلد ۷)	کو بھی مائل کرے گا۔

جو لوگ غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام پر عمل کرنے کے لیے حکومت ضروری نہیں، یا حکومت مطلوب نہیں انہیں اس سوال و جواب پر غور کرنا چاہیئے۔ حضرت ابوبکر کے جواب کی صرف عقل و نقل ہی تصدیق نہیں کرتے بلکہ ہماری پوری تاریخ اس

کی سچائی پر گواہ ہے۔

اس پوری بحث سے جو چیز نکھر کر سامنے آگئی وہ یہ ہے کہ اقامت دین یعنی دین اسلام کی مکمل پیروی کے لئے امامتِ صالحہ کا وجود انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ دین کی اقامت اس پر موقوف ہے۔

چوتھی حدیث (۴) عن ابن مسعود قالَ من کان مُستنًا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا یومن علیہ اولئک اَصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کانُوا افضل ھٰذہ الامۃ ابرھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ و لاقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوھم علیٰ اثرھم و

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی شخص کی پیروی کرنی ہی چاہے تو اسے اس کی پیروی کرنی چاہیے جو وفات پا چکا اس لیے کہ زندہ انسان کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہو سکتا کہ وہ فتنے میں مبتلا نہ ہو گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اصحاب (جو وفات پا چکے) اس امت کے سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے لوگوں میں تھے۔ ان کے دل سب سے زیادہ نیک، ان کا علم سب سے زیادہ گہرا اور ان کی زندگیاں تکلف سے خالی تھیں۔ اللہ نے

تمسکوا بما استطعتم من	انہیں اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے منتخب
اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم۔ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ	فرمایا تو اے لوگو ان کے فضل و شرف کو پہچانو۔ ان کے نشان قدم کی پیروی کرو اور حسب استطاعت ان کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کو مضبوطی سے تھامو اس لیے کہ وہ ہدایت کے سیدھے راستہ پر تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (م ۳۲ھ) کی یہ حدیث متعدد پہلوؤں سے قابل غور ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ مل کر صحابۂ کرام نے مکے اور مدینے میں جو وسیع الاطراف کارنامے انجام دیئے اور دعوت و تبلیغ سے لے کر بدر و حنین کے معرکوں تک نیز مظلومی و مغلوبی سے لیکر غلبۂ و حکومت تک جو کچھ بھی کیا اس کے لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے صرف اقامت دین کی تعبیر اختیار کی اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف یہ تعبیر قرآنی نص "ان اقیموا الدین" سے ماخوذ ہے اور دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے مشن کے لیے اس سے جامع ترین اور واضح ترین کوئی دوسری تعبیر نہیں ہو سکتی۔

اوپر جو حدیثیں گزری ہیں ان سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اقامت دین کے لیے ہوئی تھی اور دوسری یہ کہ اقامت دین کی جامع اصطلاح صرف قرآن میں نہیں بلکہ احادیث و آثار میں بھی استعمال ہوئی ہے۔

اسلامی مشن کی کامیابی

ہم قرآن کی آیتیں پیش کر کے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دور ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی تھی کہ معاندین اسلام کو شکست ہوگی اور اسلام غالب ہو کر رہے گا اس لیے کہ وہ غالب ہونے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اب ہم دو حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں بھی بات صحابہ کرام پر واضح کر دی تھی۔

پہلی حدیث

(۱) عن خباب بن الارت قال شکونا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو متوسد بردۃ لہ فی ظل الکعبۃ قلنا لہ الا تستنصر لنا الا تدعوا اللہ لنا قال کان الرجل فیمن قبلکم یحفر	خباب بن الارتؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے مصائب) کی شکایت کی جب کہ آپ کعبہ کے سائے میں اپنی ایک چادر سے تکیہ لگا کر لیٹے ہوئے تھے ہم نے کہا کیا آپ اب بھی ہمارے لیے اللہ سے مدد نہ مانگیں گے کیا آپ ہمارے لیے دعا نہ کریں گے آپ نے فرمایا تم سے پہلے کے لوگوں

لہٗ فی الارض فیجعل فیہ
فیجاء بالمنشار فیوضع
علی راسہ فیشق باثنین
ومایصدہ ذالک عن
دینہ ویمشط بامشاط
الحدید ما دون لحمہ
من لحم من عظم او
عصب ومایصدہ ذالک
من دینہ واللہ لیتمن
ھذا الامر حتی یسیر
الراکب من صنعاء الی
حضرموت لایخاف الا
اللہ والذئب علی غنمہ ولکنکم
تستعجلون۔
(بخاری باب دلائل النبوۃ فی الاسلام)

میں مرد مومن کا حال یہ تھا کہ اس کے
لیے زمین میں گڑھا کھود کر اس میں اسے
داخل کر دیا جاتا پھر آرہ لاکر اس کے
سر پر رکھا جاتا اور اسے دو ٹکڑوں
میں چیر دیا جاتا لیکن یہ عذاب بھی
اس کو اس کے دین سے نہ پھیرتا اور
کسی کے جسم میں لوہے کے کنگھے داخل کر کے
اس کی ہڈی اور پٹھے تک کھرچ دیا
جاتا لیکن یہ سزا بھی اس کو اس کے دین
سے نہ پھیرتی۔ خدا کی قسم اسلام پورا
ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ سوار صنعاء
سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اس
کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا یا یہ کہ
اس کو اپنی بھیڑ بکریوں پر بھیڑیے کے
حملے کا خوف ہو۔

بخاری کی ایک دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے کہ مشرکین کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر حضورؐ سے شکایت کی گئی تھی اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ شکایت سن کر آپ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ بایں حال کہ آپ کا چہرہ مبارک سُرخ تھا (باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ)

یہ حدیث اس کش مکش کا پورا نقشہ سامنے لے آتی ہے جو مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جاری تھی اس حدیث کے چند واضح نکات یہ ہیں :-

(۱) مکے ہی میں حضورؐ کو یہ علم عطا کر دیا گیا تھا کہ جس مشن پر آپ کو مامور کیا گیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اور جب موقع آگیا تو آپ نے خدا کی قسم کے ساتھ مؤکد کر کے یہ حقیقت صحابہ کرام پر بھی کھول دی اور اسلام کی کامیابی کا حال ایک ایسی پیشین گوئی سے واضح فرمایا کہ جس کا تصور بھی اس وقت کے جزیرۃ العرب میں مشکل تھا۔

(۲) ایسے مومنین صادقین کے مصائب و شدائد کی توضیح تسکین و تسلی کے لیے بھی تھی اور اس لیے بھی کہ راہِ حق کی مصیبتوں پر صبر کی قوت میں اضافہ ہو جائے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے اس لیے مصائب سے گھبرا کر عجلت پسندی مناسب نہیں ہے۔

مستشرقین کا ایک غلط خیال

علیہ السلام سے متعلق قرآن کی مکی آیتیں اور مضمون کی مکی حدیثیں مستشرقین اور دشمن اسلام پادریوں کے اس خیال اور اس شیطانی وسوسہ اندازی کو حرف غلط کی طرح مٹا دیتی ہیں کہ مکے میں اسلام محض ایک مذہبی دعوت تھا لیکن مدینہ پہنچ کر اچانک وہ حکومت و ریاست میں بدل گیا۔ اس خیال کی نشر و اشاعت کے پیچھے دو مقاصد کام کر رہے ہیں ایک یہ کہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ عقیدہ اتار دیا جائے کہ دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں، دین کو سیاست سے تعلق نہیں ہے دوسرا یہ کہ مکے میں اسلام، نعوذ باللہ منافقت کا لبادہ اوڑھے رہا وہاں وہ بھیگی بلی بنا ہوا لوگوں کو صرف خدا کی پوجا کی طرف بلاتا رہا اور مدینہ پہنچ کر جب طاقت حاصل ہوتی تو یک بیک اس نے آنکھیں

بدل دیں اور خیبر بن کر بے چارے مشرکین پر لوٹ پڑا۔

ان دو مقاصد میں سے جو حاصل ہو جائے "مستشرقین اور پادری کامیاب ہو جائیں گے دوسرے ملعون تر مقصد میں تو وہ کم کامیاب ہوئے ہیں لیکن پہلے مقصد میں انہوں نے اچھی خاصی کامیابی حاصل کرلی ہے ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت دین کو ایک پرائیویٹ معاملہ اور اسے سیاست سے الگ سمجھنے لگی ہے۔

مکی آیتیں (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں گزر چکا) اور اس کے معنے کی حدیثیں بغیر کسی اشتباہ کے واضح کر رہی ہیں کہ دعوت اسلام کی منزل مقصود کیا تھی اور مشرکین و مومنین کے درمیان جو کش مکش برپا ہوئی تھی اس کا انجام کیا ہونے والا تھا، مشرکین بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسلام کی دعوت محض پوجا پاٹ کی دعوت نہیں ہے اور مومنین پر بھی حضور نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ تم نے جو دین قبول کیا ہے اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

دوسری حدیث

(۲) اسی معنے کی ایک حدیث حضرت عدی بن حاتم سے روایت کی گئی ہے :-

حضرت عدی بن حاتم رضی کہتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آئے اور انہوں نے فقر و فاقہ کی شکایت کی پھر ایک دوسرے شخص آئے اور انہوں نے رہزنی یعنی راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی شکایت کی۔ تب آپ نے حضرت عدی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے عدی کیا تم نے حیرہ (عرب کی ایک حکومت کا پایہ تخت) دیکھا ہے۔

میں نے کہا۔ دیکھا تو نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے
آپ نے فرمایا اگر تمہاری زندگی طویل ہوئی تو تم بالیقین یہ دیکھو گے کہ ایک
ہودج سوار عورت حیرہ سے سفر کرے گی اور مکہ آکر کعبہ کا طواف کرے
گی اور راستے میں اس کو خدا کے سوا اور کسی کا خوف نہ ہوگا۔ حضرت عدی کہتے
ہیں کہ یہ سنکر میں نے اپنے دل میں کہا آخر قبیلہ طے کے وہ رہزن اور لیٹرے
کہاں چلے جائیں گے جنھوں نے عراق و حجاز کے راستوں کو اپنی رہزنی اور فتنہ
و فساد سے پر آشوب بنا رکھا ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر
تمہاری زندگی طویل ہوئی تو تم بالیقین دیکھو گے کہ کسریٰ کے خزانے فتح کر لیے
گئے۔ میں نے تعجب سے پوچھا کیا کسریٰ بن ہرمز؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں کسریٰ بن ہرمز!
پھر آپ نے فرمایا اگر تمہاری زندگی طویل ہوئی تو تم بالیقین دیکھو گے کہ کوئی شخص
اپنی ہتھیلی میں سونا چاندی بھر کے نکلے گا کہ کوئی اس کو قبول کرے مگر اس
کو قبول کرنے والا کوئی نہ ملے گا۔"

(بخاری، باب دلائل النبوۃ)

اسلام کے غلبہ و اقتدار اور اس کی کامیابی سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ
تمام پیشین گوئیاں، واقعات بن کر دنیا کے سامنے آچکی ہیں۔ اس حدیث سے ایک
دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ حضور کے بعد بھی جو غلبہ و اقتدار اور جو فتح و کامرانی
مسلمانوں کو نصیب ہوئی وہ اسی دعوت کا فیضان اور اسی مشن کی تکمیل تھی جسے لے
کر آپ مبعوث ہوئے تھے۔

اقامتِ دین اقامتِ قرآن کا نام ہے

اقامتِ دین کے مفہوم پر گزشتہ صفحات میں بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ہم دو حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے اس کے مفہوم کی وسعت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

پہلی حدیث

(۱) عن یحییٰ بن حصین قال سمعت جدتی تحدث انها سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فی حجۃ الوداع وھو یقول لو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا (مسلم کتاب الامارۃ)

یحییٰ بن حصین کہتے ہیں کہ میں نے اپنی دادی کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ فرماتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا اگر تم پر کوئی غلام عامل بنایا جائے اور وہ تمہاری راہنمائی کتاب اللہ کے مطابق کرے تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔

دوسری حدیث

(۲) اسی مضمون کی حدیث ابن ماجہ نے ان الفاظ میں روایت کی ہے:۔

عن ام الحصین قالت	حضرت ام الحصینؓ کہتی ہیں کہ میں
سمعت رسول اللہ صلی اللہ	نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
علیہ وسلم یقول ان امر	فرماتے ہوئے سنا کہ اگر کوئی ناک کان
علیکم عبد حبشی مجدع	کٹا ہوا حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا
فاسمعوا له واطیعوا ما قادکم	جائے تو اس وقت تک اس کی اطاعت
بکتاب اللہ	کرو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق
(ابن ماجہ ابواب الجہاد باب طاعۃ الامام)	تمہاری قیادت کرتا رہے۔

اسی مضمون کی ایک حدیث گزشتہ اوراق میں گزری ہے جس میں مَا اَقَامَ فِیْکُمْ کِتَابَ اللّٰہِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور ان دو مذکورہ بالا حدیثوں کے اندر قیادت کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے مطابق قیادت اور کتاب اللہ کی اقامت دونوں ایک ہی ہیں۔ چنانچہ بعض شارحین نے ما قادکم بکتاب اللہ کی تشریح ای یامر بدین اللہ ویحکم بہ کے جملے سے کی ہے معلوم ہوا کہ اقامتِ دین، اقامتِ قرآن ہی کا نام ہے۔

قرآن سے استشہاد خود قرآن میں اقامت کتاب اللہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے جس کا مفہوم اقامتِ دین ہی ہو سکتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ	اور اگر وہ تورات اور انجیل اور جو
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ	کچھ ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل
مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ	ہوا ہے اسے قائم کرتے تو رزق ان کے
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔	اوپر سے برستا اور نیچے سے اُبلتا۔

پھر چند آیتوں کے بعد رکوع ۱۰ آیت ۶۸ میں فرمایا :-

قُلْ یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ	کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم کسی
عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ	راہ پر نہیں ہو یہاں تک کہ تم توریت
وَالْاِنْجِیْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ	انجیل کو قائم کرو اور اس کو جو تمہارے
اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ -	رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے۔

توریت و انجیل اور قرآن کی اقامت کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ان کتابوں میں اللہ نے جو دین نازل فرمایا ہے پوری راست بازی کے ساتھ اس کی اقامت کی جائے اور آیت ۶۸ نے اہل کتاب پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جب تک تم ان کتابوں کی اقامت نہیں کرتے دینی لحاظ سے تم کچھ نہیں ہو اور تمہاری دینی زندگی لا-شئے محض ہے۔

افسوس یہ ہے کہ آج حامل قرآن امت کی اکثریت بھی ان آیتوں سے کوئی سبق نہیں لیتی اور اس کے ہزاروں دین دار افراد اقامت قرآن کی جدوجہد کے بغیر اپنے آپ کو دین کے بلند سے بلند مقام پر فائز سمجھتے ہیں۔

ان آیتوں اور ان احادیث نے اقامتِ دین کے مفہوم کو پوری طرح روشن کر دیا ہے۔ اگر کتاب اللہ تمام انفرادی و اجتماعی احکام کی جامع ہے اور اگر اس میں اصلاحِ فرد سے لیکر معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل تک کے احکام موجود ہیں تو پھر یہ بات بلا اشتباہ ثابت ہے کہ اقامت دین کے مفہوم میں یہ تمام چیزیں داخل ہیں۔

حاصلِ بحث

اب تک جو کچھ لکھا جا چکا اس کا حاصل یہ ہے :-

(۱) انبیاءِ کرام علیہم السّلام کی بعثت کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ وہ فرماں برداروں کو بشارت اور نافرمانوں کو ڈرا دھمکا کر اپنا کام ختم کر دیں اور صرف یہ بھی نہ تھا کہ وہ غیر اللہ کو سجدہ کرنے، ان کی دہائی دینے اور ان سے مدد طلب کرنے سے تو لوگوں کو منع کریں، لیکن زندگی کے دوسرے معاملات میں ان کی شریعت سازی پر انکار نہ کریں، بلکہ اللہ تعالےٰ انہیں میزان عدل اور کتاب برحق دے کر اس لیے بھیجتا رہا ہے کہ اس کے بندوں کی پوری زندگی اس دین کے مطابق بسر ہو جو اس نے نازل کیا ہے۔

(۲) اللہ کے پیغام اور اس کی کتاب برحق کی حیثیت کسی ایسی سفارش کی نہ تھی جس کو رد کر دینے پر دنیا میں اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے، بلکہ اس کی حیثیت فرمان شاہی کی تھی جس کا انکار خدا کے خلاف بغاوت اور چیلنج کے مترادف تھا اور اس کا وعدہ یہ تھا کہ وہ دینِ باطل کو مغلوب و نگوں سار اور دین حق کے حامیوں کو غالب و سربلند کرے گا۔

(۳) رسولوں اور ان کے ماننے والوں کو نجات دینے اور انہیں غلبہ و اقتدار عطا کرنے کی غرض و غایت یہ تھی کہ اس کا بھیجا ہوا دین غالب اور قائم ہو کیونکہ غلبہ و اقتدار، شریعت الٰہی کی تنفیذ کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے یا طل اقتدار کو ختم کیئے بغیر دین حق کی مکمل پیروی ممکن نہیں ہے۔

(۴) اصل دین جس پر تمام انبیاءِ کرامؑ متفق رہے ہیں صرف عقائد و عبادات اور اخلاق حسنہ نہیں ہیں، بلکہ وہ تمام انفرادی و اجتماعی احکام بھی ہیں جن پر فرد اور معاشرے کی اصلاح موقوف ہے۔ ان میں منکرین حق کے خلاف جہاد لوگوں کے

درمیان اقامت عدل اور مجرموں کی تعزیرات کے احکام بھی داخل ہیں۔ مختلف شرائع کے درمیان اختلاف محض جزوی رہا ہے۔ ان کے درمیان بنیادی وجوہری اختلاف نہ تھا۔

(۵) انبیاء کرام کے مقصدِ بعثت کے لیئے اقامتِ دین کی جامع اصطلاح صرف قرآن ہی میں استعمال ہوئی ہے بلکہ احادیث وآثار میں بھی استعمال کی گئی ہے۔ اور علماء امت برابر استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔

(۶) خدا کا بھیجا ہوا دین محض پوجا پاٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے، بلکہ اس کے دائرے میں پوری زندگی داخل ہے اس لیئے اقامت دین کا مفہوم بھی محدود نہیں ہے اور نہ سکتا ہے۔

(۷) اب امتِ مسلمہ کے لیے اقامتِ دین کے معنے اقامت قرآن کے ہیں جب تک قرآن وسنت کے تمام قوانین نافذ نہ ہو جائیں، اقامت دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

واضح دلائل

ان تمام نکات کے دلائل تھوڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کیے جا چکے ہیں اور اس سلسلے میں کتاب وسنت کے نصوص پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جو آیتیں پیش کی ہیں۔ اُن کے معنے ومفہوم سے متعلق مفسرین کی عبارتیں بہت کم نقل کی ہیں اور ایسا میں نے دو وجوہ سے بالقصد کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر میں ان کی عبارتیں نقل کرتا ہے تو پیش نظر کتاب بہت ضخیم ہو جاتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں نے مستند تفسیریں پڑھی نہ ہوں، اور جو کچھ لکھا ہو بطور خود لکھا ہو، بلکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔

مستند تفسیریں پڑھ کر لکھا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ آیتیں اپنے معنی و مفہوم پر خود اتنی صراحت سے دلالت کرتی ہیں کہ کسی تفسیری عبارت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایسی آیتوں سے تعرض ہی نہیں کیا ہے، جن میں کسی گہرے استنباط کی حاجت ہو۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ کھلے ذہن سے مسئلے پر غور کرنا چاہیں ان کے سامنے دلائل آجائیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو ماننا نہ چاہیں، یا جن کے نزدیک دلیل وہی ہو جسے وہ قرار دیں، تو ظاہر ہے ایسے لوگ میرے پیش نظر نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔

تخلیقِ انسانی کا مقصد

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہر نبی کی امت کا مقصد زیست، فریضۂ حیات اور نصب العین وہی ہوتا ہے جو خود اس نبی کا رہا ہے۔ نبی کی وفات کے بعد ان پر ایمان لانے والے لوگ اس بات کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ وہ اس مشن کو جاری رکھیں جس کے لیے اللہ نے اپنا رسول مبعوث کیا تھا۔ ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اقامت دین اور اظہار دین تھا۔ اس لیے خود بخود یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ امت مسلمہ کا فریضۂ حیات اور نصب العین بھی اقامت دین ہی ہو سکتا ہے کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ہم اقامت دین کے مفہوم پر بھی تفصیل سے لکھ چکے ہیں لیکن تمام بنی نوع انسان کے مقصد وجود کے بارے میں بالعموم اور امت مسلمہ کے مقصد حیات کے بارے میں بالخصوص قرآن کریم نے اجمال پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی تفصیل بھی سامنے آ جائے۔

انسان اس زمین پر اللہ کا نائب ہے

دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے اس اہم سوال کا صحیح جواب وہ ابتدائی سرا ہے جو اگر گم ہو جائے تو پھر زندگی کی گتھی الجھتی ہی چلی جاتی ہے اور انسان کی زندگی کا رویہ بگڑتا ہی چلا جاتا ہے اور اگر اسے یہ ابتدائی سرا مل جائے اور شعور کے ساتھ وہ مضبوطی سے اس کو تھام لے تو اس کی زندگی کی گتھی سلجھ جاتی اور وہ اپنے کمالِ ارتقا تک پہنچ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں اس سوال کا صحیح جواب عطا کیا ہے اور اگر وہ عطا نہ کرتا تو انسان کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا جس سے وہ صحیح جواب تک پہنچ سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کی حیثیت اس زمین پر خلیفۃ اللہ کی ہے وہ خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کا فریضۂ حیات کارِ خلافت کی انجام دہی ہے۔ تخلیقِ انسانی کے اس راز سے سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع میں پردہ اٹھایا گیا ہے:-

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط (البقرہ ۳۰) — اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

سورۂ بقرہ آیت ۳۰ تا ۳۹ کا متن اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ ہم یہاں صرف ترجمہ نقل کرتے ہیں:-

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا۔ کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خون ریزی کرے اور ہم تو

تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے
ہی ہیں، اس نے کہا۔ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (۳۰) اور اس نے
سکھا دیے آدم کو سارے نام پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور
کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام سے آگاہ کرو۔ (۳۱) انھوں
نے کہا تو پاک ہے، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں
بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے (۳۲) کہا اے آدم! ان کو بتاؤ
ان چیزوں کے نام تو جب اس نے بتائے ان کو ان چیزوں کے نام
تو اس نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے غیب
کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے
ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے۔ (۳۳) اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں
سے آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے اس نے انکار
کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا۔ (۳۴) اور ہم نے کہا اے آدم
تم اور تمہاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت
کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ
ظالموں میں سے بن جاؤ گے (۳۵) تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا
اور ان کو نکلوا چھوڑا، اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا
کہ اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے ایک خاص
وقت تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا پینا ہے۔ (۳۶) پھر آدم نے
پا لیے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی۔

بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (۳۷) ہم نے کہا۔ اترو یہاں سے سب۔ تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۳۸) اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۹)

سورہ بقرہ کی یہ آیتیں، اس دنیا میں انسان کی حیثیت، اس کی صحیح نوعیت زندگی اور اس کے انجام کی واقفیت کے لیے بے حد اہم ہیں۔ ان آیتوں کے تمام مشتملات و مضمرات پر گفتگو مقصود نہیں۔ زیر بحث مسئلے سے متعلق تھوڑی سی تشریح یہاں کرنی ہے آیت کے پہلے ٹکڑے کی تفسیر میں مولانا صدرالدین اصلاحی لکھتے ہیں :۔

خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے سونپے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی منشاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کئے ہوئے اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے، یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشاء کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب نمک حرامی، غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہے یہ منصب خلافت

اس کے تاج عظمت کا وہ درخشاں گوہر ہے جو کسی بھی مخلوق کو نہیں بخشا گیا۔ اس لیے اللہ تعالٰے نے اپنی نعمتوں کے سلسلۂ بیان میں اپنی اس بے نظیر نعمت کا ذکر بھی ایک خاص اہتمام سے فرمایا۔ پھر اس کی جناب سے ملائکہ کے سامنے تخلیق آدم سے پہلے ہی اس کے ارادے کا ذکر اور وہ بھی اسی منصب خلافت ہی کا نام لے کر اس کی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ شاید انسان کے اس لوعی شرف کا اس سے اونچا تخیل اور کوئی نہیں ہو سکتا اب انسان کی جس طرح یہ خود ناشناسی اور اپنی تحقیر ہے کہ وہ ان مخلوقات کے آگے سرنیاز خم کر دے جن پر اس کو نیابت آقائی اور حکمرانی کا مقام بخشا گیا ہے اسی طرح اس کی یہ خود فریبی اور خیانت اور غداری ہو گی کہ وہ اپنے اصل مالک کی مرضیات سے بے نیاز ہو کر من مانے طریقے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی اصل حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوع انسان کی تاریخ کا وہ باب پیش کر دیا گیا ہے جس کے معلوم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے بہت زیادہ قیمتی اور فلاح بخش ہیں جنھیں زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انہیں قیاس سے ربط دے کر اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہو۔

تیسیر القرآن، زندگی جلد ۵ شمارہ ۲ دسمبر ۱۹۵۰ء

آیت (۳۰) کے دوسرے ٹکڑے

وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :-

قرآن مجید کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کا نظم و نسق اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق چلانے کے بجائے اس کو من مانے طریقے پر چلایا جائے، خدا کی شریعت کی نافرمانی کی جائے اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جائے۔ زمین کے اصلی حکمران کی مرضی نظر انداز کی جائے اور خود اپنی مرضی چلائی جائے یہ چیز بجائے خود فساد فی الارض اور بغاوت ہے۔ عام اس سے کہ یہ دھینگا مشتی اور سرکشی کے ساتھ واقع ہو یا کسی فکر و فلسفہ کے تحت پر امن طریقے پر۔ اس زمین کا اصلی حکمران اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے اندر اصل حکمران کی نہیں بلکہ اصل حکمران کے نائب کی ہے اس وجہ سے اس زمین کے امن و عدل کا انحصار اس چیز پر ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خدائی قانون ہی چلے اگر اس کے کسی حصے میں خدا کا قانون باقی نہیں رہا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اس حصے میں بغاوت پھوٹ رہی ہے اور یہ چیز اس پوری زمین کے لیے خطرہ ہے

خوں ریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب خدا کا قانون عدل باقی نہیں رہے گا تو لازماً اس کی جگہ انسان کی اپنی خواہشات کی فرماں روائی ہو گی اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی شخص کی بھی جان، مال یا اس کی آبرو کے لیے کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ کسی خاص خطۂ زمین کے مفسدین بالفرض کوئی ایسا نظام بنا بھی لیں جس میں باہم گر ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دیں تو اس سے وہ اپنے لیے تو ایک تحفظ کی شکل پیدا کر لیں گے لیکن دوسروں کے لیے وہ بدستور خطرہ ہی بنے

رہیں گے۔ ان کی مثال ڈاکوؤں کے ایک جتھے کی ہوگی جس کے افراد نے آپس میں تو یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال پر دست درازی نہیں کریں گے لیکن اس جتھے سے باہر والوں کے جان و مال کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے والی کوئی چیز بھی نہ ہوگی۔ تمام عالم انسانی اور پورے کرۂ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون ہی دے سکتا ہے جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو یکساں پابند کرتا اور آزادی بخشتا ہے۔

فرشتوں نے انسان کے بارے میں اس اندیشے کا اظہار اس کے خلیفہ ہونے کی بنا پر کیا اس لیے کہ خلیفہ کے لفظ کے اندر یہ چیز چھپی ہوئی ہے کہ اس کو ایک خاص حد کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیارات تفویض ہوں گے۔ فرشتوں نے محسوس کیا کہ اختیار کو استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کو پاکر انسان بہک سکتا ہے اور اس بہکنے کا نتیجہ زمین میں برائی اور فساد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

(ماہنامہ میثاق، جلد ۲، عدد ۴، اپریل ۱۹۶۱ء)

میں نے اپنے سے زیادہ فہم قرآن رکھنے والے دو علماء کے یہ طویل اقتباسات اس لیے نقل کیے ہیں کہ میرے نزدیک امت مسلمہ کے فریضۂ حیات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے انسان کے منصب خلافت کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے اس کو نہ سمجھنے یا اس کا انکار کرنے والے اچھے اچھے دین دار مسلمانوں کا رویۂ زندگی بھی بہت ہی محدود اور ناقص ہو کر رہ جاتا ہے۔

نیابت الٰہی کس چیز میں ؟

یہ دوسرا اہم سوال ہے جو اس مقام پر سامنے آتا ہے اور اس پر غور کر لینا بھی انتہائی ضروری ہے۔ اس سوال پر غور نہ کرنے کی وجہ سے کچھ لوگوں کو لفظ "عبادت" کا مفہوم سمجھنے میں بھی الجھن پیش آتی ہے۔ اوپر جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ان میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ لیکن نمایاں نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سوال کو نمایاں کر کے اس کا جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ انسان کو خلافت ارضی کس مقصد سے عطا کی گئی ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی کو نائب مقرر کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جو کام اصل کو انجام دینا چاہیے تھے وہ اب اس کا مقرر کردہ نائب انجام دے گا۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے۔

اس دنیا میں خدا کا فرماں بردار بندہ بہت سے کام کرتا ہے۔ مثلاً وہ خدا کو پوجتا ہے اس کی پرستش کرتا ہے، اس کے سامنے رکوع اور اس کے حضور سجدے کرتا ہے اس کی تسبیح و تقدیس میں رطب اللسان رہتا ہے اور اس کے سامنے انتہائی عاجزی و نیازمندی کے ساتھ دست سوال دراز کرتا ہے لیکن کیا ان کاموں میں وہ خدا کا خلیفہ اور نائب ہو سکتا ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ خلافت اللہ کی نیابت ہے اور ان کاموں میں اس کی نیابت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرستش مخلوق کا خاصہ ہے خدا کی صفت نہیں۔ اللہ کی ذات اس سے بری ہے اسی طرح انسان کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے اور دوسری بشری حاجات پوری کرتا ہے ظاہر ہے کہ ان کاموں میں وہ خدا کا نائب نہیں ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کس چیز میں خدا کا خلیفہ ہے اس کا جواب یہی

کہ وہ اس زمین پر خدا کے احکام کی تنفیذ لوگوں کے درمیان اقامتِ عدل اور دنیا کے انتظام کی اصلاح میں خدا کا نائب ہے اور اسی مقصد سے اسے خلافت ارضی عطا کی گئی ہے فرشتوں پر انسان کو جو فضیلت حاصل ہے اسی خلافت ارضی اور اس سے متعلق اس جامع علم کی وجہ سے جو اللہ نے صرف انسان کو عطا فرمایا ہے ورنہ جہاں تک خدا کی پرستش اور اس کی تسبیح و تقدیس کا تعلق ہے، فرشتے انسان سے بہت آگے ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰،۳۱ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالٰے نے حضرت آدم کو ہر ایک چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع و نقصان کے تعلیم فرما دیا اور یہ علم ان کے دل میں بلا واسطۂ کلام القا کر دیا۔ کیونکہ بدون اس کمال علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیوں کر ممکن ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کو اس حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے امورِ مذکورہ کا سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنی اس بات پر کہ تم کار خلافت انجام دے سکتے ہو سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ لیکن انہوں نے اپنے عجز و قصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ بدون اس علم عام کے کوئی کار خلافت زمین میں نہیں کر سکتا اور اس علم عام سے قدرِ قلیل ہم کو اگر حاصل ہوا بھی تو اتنی بات سے ہم قابل خلافت نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر کہہ اٹھے کہ تیرے علم و حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

آیت کے فائدے میں لکھتے ہیں۔

اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی۔ دیکھیے عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم مگر علم میں چونکہ انسان سے کم ہیں اس لیے منصب خلافت انسان کو عطا ہوا اور ملائکہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور ہونا بھی یونہی چاہیئے۔ کیونکہ عبادت تو خاصۂ مخلوق ہے، خدا کی صفت نہیں البتہ خدا کی صفت اعلیٰ ہے اس لیے قابلِ خلافت یہی ہوئے کیونکہ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف عنہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔

قدیم مفسرین کیا فرماتے ہیں؟

اب آیئے یہ دیکھ لیں کہ ہمارے قدیم مفسرین کیا کہتے ہیں۔ امام بغویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

والمراد بالخلیفة ھھنا ادم وسماہ خلیفة لانه خلف الجن ای جاء بعدھم وقیل لانه یخلفه غیرہ والصحیح انه خلیفة اللہ فی ارضه لاقامة احکامه وتنفیذ قضایاہ	اس آیت میں خلیفہ سے مراد آدم ہیں اور ان کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ وہ جنات کے بعد ان کے جانشین بنائے گئے ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ ان کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ دوسرے لوگ ان کے جانشین ہونے والے تھے اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدم اللہ کی زمین میں اس کے احکام کی اقامت اور اس کے فیصلوں کی تنفیذ کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے۔
(معالم التنزیل)	

تفسیر خازن میں اس کی تائید ان الفاظ میں کی گئی ہے:

والصحیح انہ انما سمی خلیفۃ لانہ خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامۃ حدودہ وتنفیذ قضایاہ۔ (والباب التاویل)	اور صحیح قول یہ ہے کہ حضرت آدم خلیفہ سے اس لیے موسوم ہوئے کہ وہ اللہ کی زمین میں اس کے حدود کی اقامت اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے۔

"خلیفہ" کی تفسیر جلالین میں یہ ہے:۔

یخلفنی فی تنفیذ احکامی فیھا وھو آدم (جلالین)	وہ زمین پر میرے احکام کو نافذ کرنے میں میری نیابت کرے گا، اور وہ خلیفہ آدم ہیں۔

تفسیر بیضاوی کی عبارت یہ ہے:۔

والخلیفۃ من یخلف غیرہ وینوب منابہ والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللہ فی ارضہ وکذلک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض وسیاسۃ الناس	اور خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو دوسرے کا قائم مقام اور اس کا نائب ہو اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اس لیے وہ زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اسی طرح ہر نبی اللہ کا خلیفہ تھا۔ اللہ نے تمام انبیاء کو زمین کی آبادی، لوگوں کے امور

وتكميل نفوسهم	کی تدبیر، ان کے نفوس کی تکمیل اور
وتنفيذ امره فيهم	ان پر احکام الٰہی کی تنفیذ کے لیے
لالحاجة به تعالى	اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ اس لیے نہیں
الى من ينوب بل لقصور	کہ اللہ کسی نائب کا محتاج ہے بلکہ
المستخلف عليه عن	اس لیے کہ جن لوگوں پر اس نے
قبول فيضه وتلقى امره	اپنا نائب مقرر کیا وہ بلاواسطہ اس
بغير وسط	کے اوامر اور اس کے فیض کو قبول کرنے
(بیضاوی)	کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

اسی طرح کی عبارت روح المعانی میں بھی ہے۔ جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

(خليفة) انه خليفة	آدمؑ زمین میں اللہ کے خلیفہ
الله فى ارضه وكذا كل	تھے اور اسی طرح تمام انبیاء اللہ
نبى (روح المعانی)	کے خلیفہ تھے۔

مفسرین کرام کی ان عبارتوں سے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ نہ صرف حضرت آدمؑ بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو جو خلافت ارضی عطا کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا:۔

زمین کی آبادی، لوگوں کے لیے سیاست کی انجام دہی (یعنی ان کے تمام امور و معاملات کا انتظام اور تدبیر) ان کے نفوس کی تکمیل۔ اللہ کے شرعی فیصلوں کی تنفیذ اور حدودِ الٰہی کی اقامت۔

اقامتِ دین کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے؟ ہم نے گزشتہ صفحات میں

قرآن و حدیث کے نصوص پیش کر کے بعثتِ انبیاء کے مقصد پر جو گفتگو کی ہے مفسرین کرام کی عبارتیں عین اس کے مطابق ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثتِ انبیاء ہی کا مقصد نہیں، بلکہ تخلیقِ انسانی کا مقصد بھی اقامت دین ہی تھا۔

حضرت آدم کے واسطے سے ان کی پوری ذریت قیامت تک کے لئے خلافت ارضی کی حامل ہے۔ اس لیے نہ صرف امت مسلمہ بلکہ مقصدِ تخلیق کے لحاظ سے تمام بنی نوع انسان کا فریضہ، حیات اور اس کا مقصد وجود اقامت دین کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس زمین پر انسان بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ خدا کے دین و شریعت اور اس کے آئین و قانون کی پابندی کرے اور اسی کے مطابق دنیا کا انتظام چلائے

قرآن سے استشہاد

خود سورۂ بقرہ کی منقولہ بالا آیتوں میں اور قرآن کی دوسری آیتوں میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ زمین میں انسان کو کس غرض سے خلیفہ بنایا گیا ہے۔ فرشتوں کے اس استفہام پر غور کیجیے جو انہوں انسان کی خلافت کے بارے میں کیا تھا۔ انہوں نے رب العلمین سے سوال کیا۔

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ	کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خوں ریزی کرے۔
(بقرہ)	

غور کیجیے، فرشتوں کو انسان کے بارے میں یہ اندیشہ کیوں پیدا ہوا؟ اور انہوں نے انسان کی جس کمزوری اور اس کے جس عیب کا ذکر کیا اس کا تعلق کس چیز سے ہے کیا اس کا تعلق حکومت و سیاست اور انتظام مملکت سے نہیں ہے؟ حکومت نام ہی ہے اس ادارے کا جو ملک کے انتظام کو درست رکھے، اس کو فساد سے

بچائے اور باشندگانِ ملک کی جان و مال کی حفاظت کر کے امن و امان قائم کرے۔ فرشتوں کا شبہ یہ تھا کہ جو مخلوق تیری زمین کے انتظام کو بگاڑے گی اور امن و امان کو درہم برہم کرے گی، آخر تو اس کے ہاتھ میں عنانِ حکومت کس مصلحت سے دے رہا ہے۔

فرشتوں کے اس سوال کے تحت اوپر ہم نے مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر کا جو اقتباس دیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ تفسیر کبیر میں بھی ہیں فرشتوں کے سوال کی ایک توجیہ ان الفاظ میں ملتی ہے:

اذا کان معنی الخلیفۃ	جب خلیفہ کے معنی ہیں وہ
من یکون نائباً للہ تعالیٰ	شخص جو اللہ کا نائب ہو حکومت
فی الحکم والقضاء والاحتیاج	اور فیصلے میں، اور حاکم و قاضی کی
الی الحاکم والقاضی انما	ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب
یکون عند التنازع والتظالم	تنازعہ اور جور و ظلم موجود ہو تو
کان الاخبار عن وجود الخلیفۃ	وجودِ خلیفہ کی خبر میں التزاماً یہ
اخباراً عن وقوع الفساد والشر	خبر بھی موجود تھی کہ فساد اور شر
بطریق الالتزام (تفسیر کبیر، جلد ۱)	واقع ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر نوعِ انسانی کو اختیارات دے کر حکومت اور لوگوں کے درمیان اقامتِ عدل کے لیے خلافت نہ عطا کی جا رہی ہوتی تو فرشتے ہرگز یہ سوال ہی نہ کرتے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اختیارات دے کر ایک ایسی مخلوق پیدا ہی کیوں کی جائے جو فساد بپا کرے اور خونریزی کرے۔ ایک ایسی

مخلوق کو منصبِ خلافت عطا کیے جانے کی حکمت ان کے فہم سے باہر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو علم اسماء عطا کیا اور اس کا مظاہرہ کرا کر فرشتوں کو اپنی حکمت سمجھائی اور انسان کو منصبِ خلافت عطا کیے جانے پر مطمئن کیا۔

"خلیفہ" کا لفظ ایک جگہ اور قرآن میں نازل ہوا ہے اس پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ	اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین
خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ	میں اپنا نائب بنایا ہے لہذا تم
بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ	لوگوں میں حق و انصاف کے ساتھ
لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ	حکومت کرو اور اپنی خواہش کی
عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّ	پیروی نہ کرو۔ ورنہ وہ تمہیں اللہ
الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ	کے راستے سے بھٹکا دے گی۔
سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ	بے شک اللہ کے راستے سے جو لوگ
عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا	بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت
نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ہ	عذاب ہے اس وجہ سے کہ انہوں
(ص ر ۲)	نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔

معلوم ہوا کہ انہیں خلافت اس لیے دی گئی تھی کہ وہ خدا کے اتارے ہوئے قانونِ عدل کے مطابق حکومت کریں اور مقدمات کا فیصلہ سنائیں اور اس معاملے میں اپنی خواہشِ نفس کو ذرہ برابر دخل انداز نہ ہونے دیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک ذرا سی لغزش پر تنبیہہ کی گئی تھی۔ جس کا ذکر اس آیت سے پہلے موجود ہے۔

ان تمام دلائل سے یہ بات بلا اشتباہ ثابت ہوتی ہے کہ زمین میں نوعِ انسانی

کی تخلیق اور خدا کے فرماں بردار بندوں کی زندگی کا مقصد خدا کے قانون کی پابندی اور دنیا میں اس کی اقامت اور تنفیذ ہے۔

منصبِ خلافت کا اہل کون ہے

منشائے تخلیق اور حامل خلافت ہونے کی جہت سے ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے۔ لیکن یہ بات خلافت کی عین حقیقت میں داخل ہے کہ انسان خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کو اس کی مرضیات کے مطابق استعمال کرے۔ وہ اپنے مالک کے احکام کا خود پابند ہو اور دوسروں کو پابند بنائے۔ ورنہ وہ خلافت کی پابندی سے ڈھلک کر بغاوت کے کھڈ میں جا گرے گا۔ مولانا امین احسن اصلاحی خلافت کے تقاضے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> عین منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ منصب صفات کے ساتھ مشروط ہو، غیر مشروط نہ ہو۔ یعنی منشائے خلقت کے لحاظ سے تو یہ منصب تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے۔ ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے لیکن اس منصب کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے جائز حق دار وہی ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں جو اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ نہیں بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔
>
> (میثاق جلد ۲ عدد ۶)

جب مومنین صالحین ہی خلافت الٰہی کے مستحق ہیں تو ان کے منصب کا یہ عین تقاضا ہے کہ وہ دوسرے گرے ہوئے انسانوں کو بغاوت کی پستی سے اٹھا کر خلافت کی پابندی تک پہنچانے کی سعی کریں۔ آج دنیا میں انسانوں کی اکثریت خدا کی بغاوت

پر کمر بستہ ہے اور منصب خلافت اپنے مستحقین کو آواز پر آواز دے رہا ہے کہ وہ اس بغاوت کو اطاعت سے بدلنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں، ورنہ وہ کار خلافت کی انجام دہی میں ناکام ہو جائیں گے۔

نظریہ خلافت پر مبنی ایک نظام کی ضرورت اوپر کی تفصیل سے یہ بات خود ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ تعالٰی نے اپنے فرماں بردار بندوں کو جو خدمت سپرد کی ہے وہ ایک ایسے نظام کی متقاضی ہے جس کی بنیاد نیابت الٰہی کے نظریے پر رکھی گئی ہو۔ جب تک ایک ایسا صالح اور طاقتور نظام وجود میں نہیں آجاتا۔ یہ خدمت پوری طرح انجام نہیں دی جا سکتی خدا کی بغاوت اور خواہش نفس پر مبنی نظام کی ماتحتی میں کار خلافت کی تکمیل ایک ایسا خیال ہے جس کو خیال خام ہی کہا جا سکتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی تحریر فرماتے ہیں:۔

> ہمنصب اپنے مزاج کے لحاظ سے صرف ایک انفرادی منصب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی اور سیاسی منصب بھی ہے تمام انسانوں کو یا کم از کم ان سارے لوگوں کو جو اس منصب کی ذمہ داریوں پر ایمان رکھتے ہیں، انفرادی طور پر بھی اس منصب کے فرائض پورے کرتے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نظام قائم کرنا ہے کیونکہ اس نظام کے بغیر اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔
>
> (ماہنامہ میثاق جلد ۲)

ایک شبہے کا جواب:۔ اگر کسی کو شبہہ ہو کہ جب تفسیر کی کتابوں میں انسان کو اس

معنے میں بھی خلیفہ کہا گیا ہے کہ یہ اپنی پیش رو مخلوق جنات کا جانشین ہے تو پھر اس کو خدا کا خلیفہ قرار دینا متعین کہاں باقی رہتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات کی جانشینی کا قول بہت ضعیف ہے اور اس کی کوئی قوی دلیل موجود نہیں ہے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر تخلیق آدم کا واقعہ منقول ہے لیکن اس بات کا کہیں اشارہ بھی موجود نہیں ہے کہ ان کو جنوں کی جگہ لینے کے لیے پیدا کیا جا رہا ہے۔ ان مقامات کے علاوہ بھی کہیں اس بات کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا کہ اس زمین پر پہلے جنات کی حکمرانی تھی اور ان کو ہٹا کر ان کی جگہ پر انسان کو آباد کیا گیا ہے۔ اس قول کی تائید میں کوئی صحیح حدیث بھی نہیں عقل و درایت کے لحاظ سے بھی یہ قول کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا قول قوی دلائل سے مدلل ہے اور قرآن میں اس کے واضح اشارات موجود ہیں بلکہ بقول مولانا امین احسن اصلاحی:-

"انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ اور نائب کی ہے یہ بات قرآن مجید میں نہایت واضح طور پر کہی گئی ہے"

یہی وجہ ہے کہ کسی ایک معتمد مفسر قرآن اور عالم دین نے بھی اپنی کسی کتاب میں جنات کی جانشینی کے قول کو ترجیح نہیں دی ہے بلکہ عام طور سے مفسرین کرام اور علمائے دین نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ ہی قرار دیا ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اب یہ بات علمائے امت کے درمیان تسلیم شدہ ہے۔ اس کی ایک اور مضبوط دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے لیے جس کے سربراہ اور کارندے اللہ کے تشریعی قوانین کی تنفیذ میں محض اس کے نائب کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت ہی کا لفظ اختیار فرمایا ہے اور خلافتِ راشدہ صحیح اور معیاری اسلامی حکومت کے لیے بلند ترین آئیڈیل بن گئی ہے اور یہ ہم سب کو معلوم ہے کہ خلافت راشدہ کا تصور خدائی نیابتی حکومت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ظاہر ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ قرآن ہی کے الفاظ کو سامنے رکھ کر استعمال فرمایا ہے پھر اللہ نے بنی آدم کو اپنی دوسری مخلوقات کے مقابلے میں جو کرامت، عزت اور شرف عطا فرمایا ہے اس کے لحاظ سے دیکھیے جب بھی جنات کی جانشینی کا قول بہت ہی پست محسوس ہوتا ہے۔ حضرت آدم کو اللہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ ان کے کالبد میں اپنی روح پھونکی ان کے سامنے فرشتوں کو جھکایا۔ ان کو اپنی صفت جلال و جمال کا مظہر بنایا۔ ان کے لیے تمام کائنات کو مسخر کیا، ان کی ذریت میں ہزاروں انبیاء پیدا ہوئے اور انہیں کی ذریت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وجود بخشا گیا، جو بلا اختلاف خدا کی تمام مخلوقات سے افضل، اکرم، برتر اور اشرف ہیں۔ ایک ایسی مخلوق کو خلیفۃ اللہ کے بجائے خلیفۃ الجن قرار دینا کس قدر ہلکی اور بے وزن معلوم ہوتی ہے ان تمام بینات کے باوجود اگر کوئی شخص انسان کو جنات کا جانشین سمجھتا ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔ میں نے اس موضوع پر مستقلاً تفصیل سے لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی کہ میں نے اوپر جو کچھ ثابت کیا ہے اس میں انسان کو جنات کا جانشین مان لینے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا اگر بالفرض یہ بات مان لی جائے کہ انسان جنات کا جانشین ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کس مقصد سے اس زمین پر آباد کیے گئے تھے اور ان کی حیثیت اس زمین میں

میں کیا تھی ؟ اوران کا [redacted] جرم کیا تھا جس کی پاداش میں فرشتوں کی فوج بھیج کر انہیں منتشر کیا گیا اوران کی جگہ لینے کے لیے انسانوں کی ایک نئی مخلوق پیدا کی گئی کیا ان پر اللہ نے یہ ذمہ داری عائد نہیں کی تھی کہ وہ زمین میں اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں اور اس کا انتظام اس کی مرضیات کے تحت چلائیں ظاہر ہے کہ کوئی صاحب عقل اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا تو پھر انسان کو جنات کا جانشین قرار دینے سے اصل بات پر کیا اثر پڑیگا اور اس میں کیا فرق واقع ہو جائے گا بس فرق یہ واقع ہوگا کہ پہلے یہ ذمہ داری جنات کے سپرد کی گئی تھی اور اب انسان کے سپرد کر دی گئی ہے۔

سورۂ ذاریات کی ایک آیت انسان کے منصب خلافت کی اس تفصیل کو سامنے رکھ کر اب ہمیں قرآن کی اس آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ٥ پر غور کر لینا چاہیے۔ کیونکہ سورۂ ذاریات کی اس آیت کا ایک بہت ہی محدود اور ناقص مفہوم کچھ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس آیت میں عبادت کے معنے صرف پرستش میں اللہ کی پرستش ہی وہ چیز ہے جس کے لیے جن وانس کی تخلیق کی گئی ہے اس خیال نے چونکہ دین اسلام کے مفہوم کو محدود اور ناقص بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے اس پر غور کر لینا بہت ضروری ہے

عبادت کے معنی متعین کرنیکا صحیح طریقہ اللہ تعالےٰ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے یہاں جو چیز بھی موجود ہے۔ سب اس کی مملوک ہے اور یہ بات بھی قرآنی نصوص سے معلوم ہے کہ

دنیا کی تمام چیزیں اپنے مالک کی عبادت و تسبیح میں مشغول ہیں۔ انسان بھی خدا کا بندہ اور اس کا غلام ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنے اس با اختیار (جو حیوانات و جمادات کی طرح مجبور نہیں ہے) بندے کو کس قسم کی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ کون سی عبادت ہے جس کا یہ مکلف بنایا گیا ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ انبیاء کرام بھی لوگوں کو اللہ کی عبادت ہی کی طرف بلانے کے لیے مبعوث ہوتے رہے ہیں اس لیے بہت ضروری کہ ہم اس عبادت سے واقف ہوں جس کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے اسی میں ہماری نجات و فلاح ہے۔ لغت، قرآن اور احادیث میں "عبادت" کے ایک معنی پرستش کے بھی آئے ہیں۔ اس لیے اس آیت میں عبادت کا مفہوم متعین کرنے کے لیے ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس کو پرستش کے معنے میں لے لیا جائے اور اپنی زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے اس کا صرف ایک خانہ اللہ کی پرستش کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر لیا اور ہم خدا کی رحمتوں، برکتوں، خوشنودیوں اور اس کی جنتوں کے مستحق بن گئے۔ یہ طریقہ آسان تو بہت ہے لیکن صحیح بالکل نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام لغوی معانی، قرآن کی متعلقہ آیات، مسئلے سے متعلق احادیث اور شریعت کے تمام واجب التعمیل احکام کو سامنے رکھ کر عبادت کا مفہوم متعین کیا جائے ورنہ ہم لیے آپ کو ایک بہت بڑے خطرے میں مبتلا کر لیں گے۔ ہمارے عام دینی لٹریچر میں بھی اور جماعت اسلامی کے لٹریچر میں بھی اس اہم موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اور قرآنی آیات سے یہ

بات ثابت کی گئی ہے کہ ہم سے جس عبادت کا مطالبہ کیا گیا ہے اور جس عبادت کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں، وہ صرف پرستش نہیں ہے لغت اور قرآن کے نصوص پیش کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت کے معنے صرف پرستش نہیں ہیں۔ میں یہاں ان تمام دلائل کو دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا میں چند دوسرے پہلو ذرا تفصیل سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اگر اس آیت میں عبادت کے معنے صرف پرستش لیے جائیں تو نہ صرف یہ کہ قرآن کی متعدد آیات سے اس کا تصادم ہو گا بلکہ فی الواقع پورے قرآن سے یہ مفہوم ٹکرا جائے گا میں یہاں چند آیات پیش کرتا ہوں۔

سورۂ البقرہ کی آیت ۳۰ تا ۳۹

(۱) اگر صرف سورہ بقرہ کی ان آیتوں کو سامنے رکھ لیا جائے جن میں انسان کی تخلیق سے متعلق سرگزشت بیان کی گئی ہے اور جس کی تفصیل اوپر کے صفحات میں گزر چکی تو یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ سورۂ ذاریات کی اس آیت میں "عبادت" کو صرف پرستش کے معنے میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے ورنہ آیت خلافت اور آیت عبادت میں ناقابل حل تضاد اور تناقض پیدا ہو جائے گا یہ بات پہلے مدلل طور پر لکھی گئی ہے کہ انسان کو دنیا میں اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ نیابت الٰہی کس چیز میں ہے اس لیے انسان کے ذمے جو عبادت کی گئی ہے وہ صرف پرستش کبھی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے ساتھ زندگی بھر معاملے میں خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے اللہ کی کامل اطاعت بھی ضروری ہے انسان کے ذمے جو عبادت کی گئی ہے وہ پرستش اور اطاعت و بندگی کا مجموعہ ہے صرف پرستش نہیں۔

سورۂ احزاب کی آیت ۷۲

(۲) سورۂ احزاب کے آخیر رکوع آیت ۷۲ میں اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ اس نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے "امانت" پیش کی لیکن ان سب نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خوفزدہ ہو گئے لیکن انسانوں نے وہ بارِ امانت اٹھا لیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی امانت تھی جسے قبول کرنے سے آسمان، زمین اور پہاڑ تھرا گئے اور انسان نے اسے قبول کر لیا؟ کیا صرف اللہ کی پرستش؟ ظاہر ہے کہ یہ جواب صحیح نہیں۔ اس لیے کہ جہاں تک اللہ کی تسبیح و تقدیس اور اس کی پرستش کا تعلق ہے۔ آسمان زمین پہاڑ بلکہ پوری کائنات اس کام میں اپنے یوم پیدائش سے لگی ہوئی ہے اور لگی رہے گی۔ قرآن کہتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ	ہر شے اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہی ہے لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:-

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند ستارے، پہاڑ، درخت

وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴿سجدہ﴾ جانور اور بہت سے انسان۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو یاد
لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں
وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ	میں ہیں اور زمین میں ہیں اور
كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ	پرندے پر کھولے ہوئے۔ ہر ایک کو
وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ	اپنی عبادت اور تسبیح کا طریقہ معلوم
بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝	ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ
(النور ر۶)	اسے جانتا ہے۔

یہ تین آیتیں بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہیں کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی پرستش میں مشغول ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سب کے سب اطاعت گزار اور فرمانبردار بھی ہیں سورۂ بقرہ میں ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ	اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا کوئی
وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ لَّهٗ	لڑکا ہے۔ اس کی ذات ان
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ	باتوں سے پاک ہے بلکہ حقیقت
كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝	یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں
	جو کچھ ہے وہ سب کا مالک ہے اور
(ر۱۴)	سب اس کے تابعدار ہیں۔

پھر یہ تابعداری و اطاعت گزاری جبر و زور سے نہیں۔ بلکہ خوشی اور رغبت کے

ساتھ ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی	پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ
السَّمَاءِ وَھِیَ دُخَانٌ	ہوا، اس حال میں کہ وہ دھواں
فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا	تھا۔ اس نے آسمان اور زمین
طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَا	سے کہا۔ بطوع و رغبت آؤ یا
اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ ۝	بجبر و زور، ان دونوں نے کہا ہم رغبت
(حٰمٓ السجدہ ۲)	اور خوشی کے ساتھ حاضر ہیں۔

آسمان و زمین، سورج اور چاند، درخت اور پہاڑ، چرند و پرند کو ہم مجبور صرف اس معنے میں کہتے ہیں کہ جو خدمت ان کے ذمے لگائی گئی ہے وہ اس سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتے اس معنے میں نہیں کہ جو خدمت و پرستش ان کے ذمے کی گئی ہے وہ اسے بجبر و اکراہ انجام دے رہے ہیں۔ نہیں بلکہ سب کے سب اللہ کے حضور بطوع و رغبت سربسجود ہیں اور جو خدمت بھی انجام دے رہے ہیں پوری خوشی سے انجام دے رہے ہیں۔

ان آیتوں کو پڑھیے اور اس کے بعد سورۂ احزاب کی آیت امانت کا مطالعہ کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ اللہ نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے جو امانت پیش کی تھی اور جسے قبول کرنے سے انہوں نے انکار کیا وہ ہرگز وہ خدمت اور وہ پرستش نہیں ہو سکتی جسے وہ اپنے پیدائش سے انجام دیتے رہے تھے، بلکہ یہ امانت کوئی اور شئے تھی جسے قبول کرنے کے وہ اہل نہ تھے۔ اس تفصیل سے یہ سوال پھر لوٹ آیا ہے کہ وہ امانت کیا تھی جسے قبول کرنے سے انہوں نے انکار کیا

انسان نے قبول کر لیا۔

اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ وہ امانت دنیا میں خلافت و نیابت تھی جسے قبول کرنے سے پوری کائنات تھرا اٹھی۔ ایک ایسا عہدہ تکلیف؛ ایک ایسی باشعور و با اختیار ذمہ داری جس کی ٹھیک ٹھیک ذمہ داری پر سلطان کائنات کی خوشنودی اور اس کی لہلہاتی ہوئی جنت کا وعدہ اور جس میں خیانت و نافرمانی کے کرتوت پر اس کے غضب اور بھڑکتی ہوئی جہنم کی وعید تھی اور یہ بات ظاہر ہو کہ اللہ نے انسان کو صرف اپنی پرستش کا مکلف نہیں قرار دیا ہے بلکہ بہت سے فرائض و واجبات کا مکلف قرار دیا ہے اس لیے اگر سورۃ ذاریات کی آیت میں عبادت کا مفہوم صرف پرستش لیا جائے تو سورۃ احزاب کی آیت امانت سے ٹکراؤ پیدا ہو گا۔

سورہ ہود کی آیت

سورۃ ہود آیت ۷ میں فرمایا:

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"

یہی مضمون ایک دوسرے انداز میں سورہ کہف آیت (۷) میں یوں ادا کیا گیا ہے

"یہ جو کچھ سر و سامان زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"

سورہ ملک آیت (۲) میں ارشاد ہوا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

جس نے موت اور زندگی پیدا کی تاکہ تم کو جانچے تم میں کون اچھا عمل کرتا ہے۔

ان آیتوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ صرف انسان ہی کی تخلیق نہیں، بلکہ یہ سارا ہنگامۂ وجود جس غرض سے برپا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے حسن عمل کی آزمائش کی جائے یہ دیکھا جائے کہ ان میں کون اچھے عمل کرتا ہے اور کون برے عمل؟ آسمان و زمین پر انسان کو بسایا کہ اس کے عمل کی آزمائش کی جائے اب سوال یہ ہے کہ "اچھا عمل" کیا صرف خدا کی پرستش میں محدود ہے؟ کیا قرآن سے معمولی واقفیت رکھنے والا مسلمان بھی اس طرح کی بات کہہ سکتا ہے؟ سورۂ انعام کی آخری آیت میں فرمایا:

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ۔

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے کیا اس کی آزمائش صرف پرستش سے پوری ہو جاتی ہے؟ اگر انسانی اعمال کے دائرے میں پرستش کے علاوہ بھی بہت سے اعمال داخل ہیں اور یقیناً داخل ہیں اور اگر انسان کے زیر تصرف دیا ہیں بہت سی چیزیں دی گئی ہیں جن میں اس کی آزمائش مقصود ہے تو پھر سورۂ ذاریات میں عبادت

کے معنے صرف پرستش لینا کسی طرح بھی صحیح ہے؟ اور اگر یہ مفہوم لیا جائے تو کیا ان آیتوں سے اس کا تصادم نہیں ہوتا؟ اس طرح کا تضاد تو کسی عاقل انسان کے کلام میں بھی نہیں پایا جانا چاہیے اللہ رب العلمین کے کلام میں کس طرح پایا جائے گا۔ کہ کہیں تو وہ کہ دے کہ انسان کو ہم نے دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے کہیں کہے کہ ہم نے اس کو ایک ایسی امانت سپرد کی ہے جس کو قبول کرنے سے آسمان پہاڑ اور پہاڑ بھی لرز اٹھے۔ کہیں یہ کہے کہ ہم نے سارا ہنگامۂ وجو[د] انسان کے اعمال و تصرفات کی آزمائش کے لیے برپا کیا ہے اور سورۂ ذاریات میں یہ فرما دے کہ ہم نے انسان کو صرف اپنی پرستش کے لیے پیدا کیا ہے جو لوگ پرستش کے سوا زندگی کے دوسرے معاملات میں اللہ کی اطاعت سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے سورۂ ذاریات کی زیر بحث آیت کو استعمال کرتے ہیں ان سے گفتگو نہیں۔ ہاں جو لوگ واقعی خدا کے فرمان بردار بندے کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انہیں ضرور غور کرنا چاہیے کہ انہوں نے اس آیت میں عبادت کے معنے صرف پرستش لے کر کس قدر دھوکا کھایا ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی اللہ نے اپنی عبادت کا مطالبہ کیا ہے اس میں اس کی والہانہ پرستش اور غلامانہ اطاعت دونوں داخل ہیں اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس کی عبادت کے دائرے سے خارج نہیں ہے مسجد میں جا کر نماز پڑھنا بھی عبادت ہے اور بازار میں بیٹھ کر صداقت و دیانت کے ساتھ تجارت کرنا بھی عبادت ہی ہے۔

اللہ کی پرستش کس طرح کی جائے

(۴) اگر سورۂ ذاریات کی آیت میں عبادت کے معنے صرف پرستش ہیں

اطاعت اس میں داخل نہیں تو سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پرستش کس طرح کی جائے؟ کیا ہر انسان کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اللہ کی پرستش کرے؟ اگر اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ اس میں اللہ کے احکام کی اطاعت ضروری ہے تو ثابت ہو گیا کہ اس آیت میں عبادت کے معنے صرف پرستش نہیں ہیں پرستش اور اطاعت دونوں ہی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف پرستش میں خدا کی اطاعت کا مکلّف ہے اور دوسرے معاملات میں مکلف نہیں ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہو گا کہ اس تفریق کی دلیل کیا ہے اس تفریق کے لیے کوئی عقلی اور شرعی دلیل لانا ممکن ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ جو لوگ عبادت کو صرف پرستش کے معنے میں لیتے ہیں وہ سوچ سمجھ کر یہ بات نہیں کہتے اس لیے کہ کوئی مخلص مسلمان اس تفریق کا قائل نہیں ہو سکتا کہ اعمال پرستش میں تو انسان خدا کی اطاعت کا مکلّف ہے اور دیگر معاملات میں مکلّف نہیں ہے اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ پرستش کے سوا انسان کسی اور چیز کا مکلف نہیں ہے۔

اگر ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیے تو واقعہ یہ ہے کہ کوئی پرستش بھی اطاعت سے خالی نہیں ہوتی کبھی اس کی اطاعت ہوتی ہے جس کی پرستش کی جارہی ہے اور کبھی پرستش کسی کی ہوتی ہے اور اطاعت کسی اور کی یہاں تک کہ پتھر کے بتوں کی پرستش بھی اطاعت سے خالی نہیں ہوتی وہاں یا تو آباء و اجداد کی اطاعت ہوتی ہے۔ یا شیطان کی یا اپنے نفس کی۔

اتنی وضاحت کے بعد اس کی ضرورت نہ تھی کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ

اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ہ کے بارے میں مفسرین قرآن کی تفسیریں نقل کی جاتیں لیکن مزید توثیق کے طور پر امام رازی کی تفسیر نقل کر رہا ہوں۔ وہ اس آیت کی تفسیر میں ایک سوال قائم کر کے اس کا جواب دے رہے ہیں۔

امام رازیؒ کی تفسیر

ما العبادة التي خلق الجن والانس لها؟ قلنا التعظيم لامر الله والشفقة على خلق الله فان هذين النوعين لم يخل شرع منهما واما خصوص العبادات والشرائع فمختلفة فيها بالوضع والهيئة والقلة والكثرة والزمان والمكان والشرائط والاركان ولما كان التعظيم اللائق بذي الجلال والاكرام لا يعلم عقلا لزم اتباع الشرائع فيها والاخذ بقول الرسل عليهم السلام فقد انعم الله

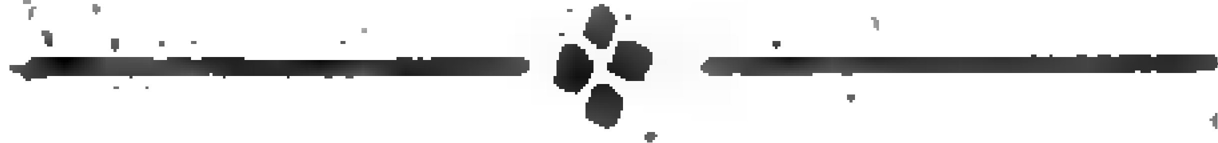
وہ عبادت کیا ہے جس کے لیے جن و انس پیدا کیے گئے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ وہ امر الٰہی کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت ہے اس کے لیے ان دو نوعوں سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی ہے۔ ہاں ان دونوں نوعوں کی عبادات اور جزئی احکام اپنی وضع و ہیئت، قلت و کثرت، زمان و مکان اور شرائط و ارکان کے لحاظ سے مختلف رہے ہیں اور چونکہ ایسی تعظیم جو اللہ ذو الجلال والاکرام کے لائق ہو صرف عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی اس لیے اس میں شرعی احکام کی پیروی اور قول رسول کی اتباع لازمی ہوئی اس لیے اللہ نے رسول بھیج کر اور عبادت کی ان دونوں نوعوں کے

علی عبادہ بارسال الرسل وایقاء السبیل فی نوعی العبادۃ (تفسیر کبیر ج ۲) طریقے واضح کر کے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے۔

اس عبارت سے بھی یہ صراحت معلوم ہوا کہ سورہ ذاریات کی اس آیت "عبادت" صرف پرستش کے معنے میں نہیں ہے بلکہ اس عبادت کے دائرے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں داخل ہیں اور انسان عبادت کی ان دونوں قسموں کا مکلف ہے۔ عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور دوسری کا حقوق العباد سے اللہ کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے اور بندوں کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے اور انسان کی تخلیق ان دونوں ہی عبادت کے لیے ہوئی ہے امام رازی کی اس تشریح سے بھی یہ بات واضح ہوئی کہ انسان پورے دین اسلام کی پیروی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ دین اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مجموعے کا نام ہے دین کا کوئی حکم بھی لے لیجیے اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو گا یا حقوق العباد سے یا دونوں سے اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کا تعلق نہ اللہ کے حق سے ہو اور نہ بندے کے حق سے۔

اس تفصیل سے پوری طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ سورہ ذاریات کی اس آیت کا غلط مطلب نکال کر جو لوگ صرف نماز روزے، تسبیح و تہلیل اور اسی طرح کے دوسرے مظاہر پرستش ہی کو عبادت سمجھتے ہیں اور زندگی کے دوسرے معاملات میں اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت کو عبادت نہیں سمجھتے وہ سخت دھوکے میں مبتلا ہیں۔ آخرت میں تو جو کچھ ہو گا وہ تو ہو گا ہی۔ اس دنیا میں بھی اس غلط فہمی نے امت مسلمہ کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہی ہے۔

اگر کوئی شخص یا گروہ ان دلائل کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے آپ کو جنّات کا خلیفہ سمجھنے اور عبادت کو صرف پرستش میں محدود کرنے پر اصرار کرتا ہے تو اس کو اس کا اختیار ہے۔ مگر ہر کس بقدر ہمت اوست۔



اُمّتِ مُسلمہ کا نصبُ العین

آیتِ خلافت وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً
اور آیتِ عبادت (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ)
سے عمومی انداز میں امت مسلمہ کا نصب العین اور اس کی حیثیت واضح ہوئی
تھی لیکن قرآن نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ مخصوص طور پر بھی امت مسلمہ
کے منصب کی توضیح کی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ پڑھیے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک
اُمَّةً وَّسَطًا	بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ	پر گواہ ہو اور رسول تم پر
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۱۷)	گواہ ہو۔

قرآن کی موجودہ ترتیب کے لحاظ سے یہ سب سے پہلی آیت ہے جو براہِ
راست امتِ مسلمہ کے منصب کی وضاحت کرتی ہے۔ میں یہاں شیخ محمد عبدہٗ
اور سید رشید رضا مصری کی تفسیر و تشریح کا حاصل اپنی زبان میں درج کرتا ہوں۔

وسط، عدل و خیر کو کہتے ہیں وہ اسی طرح کہ کسی امر میں شئے مطلوب پر زیادتی افراط ہے اور کمی تفریط و تقصیر ہے افراط و تفریط میں سے ہر ایک سیدھے اور ٹھیک راستے سے انحراف ہے اس لیئے ان میں ہر ایک شر ہے اور قابل مذمت ہے۔ اور خیر وہ نقطۂ اعتدال ہے جو کسی امر کے دونوں کناروں کے درمیان ہوتا ہے یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ اس آیت میں لفظ "وسط" کیوں اختیار کیا گیا جب کہ مقصود اس امت کے خیر امت ہونے کا اعلان کرنا ہے۔ خیر کے صریح لفظ کو چھوڑنے کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا پہلا جواب یہ ہے کہ لِتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ میں جو علت بیان کی گئی ہے یہ لفظ اس کے لیے بطور تمہید اختیار کیا گیا ہے کیونکہ کسی شے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کا عارف بھی ہو اور عارف وہی ہو گا جو دو کناروں کے درمیان ہو وہ ایک کنارے کو ایک جانب دیکھے گا اور دوسرے کو دوسری جانب سے اور جو ایک کنارے پر ہو گا وہ دوسرے کنارے کی حقیقت حال سے ناواقف ہو گا بلکہ وہ وسط کی حقیقت حال سے بھی لاعلم ہو گا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ لفظ وسط سے امت مسلمہ کے خیر امت ہونے کا سبب بھی معلوم ہو رہا ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بہترین امت اس لیے ہیں کہ وہ امت وسط ہیں نہ تو دین میں غلو کر کے افراط اختیار کرتے ہیں اور نہ کمی کر کے تفریط کے مرتکب ہوتے ہیں وہ عقائد، اعمال اور اخلاق سبھی چیزوں میں توسط و اعتدال کے مرکز پر مقیم ہیں۔

بات یہ ہے کہ لوگ ظہور اسلام سے قبل دو قسموں میں بٹے ہوئے تھے

ایک قسم تو وہ تھی جس پر مادیت چھائی ہوئی تھی اس کے نزدیک جسمانی لذت اندوزیوں کے سوا دوسری کوئی چیز قابل لحاظ نہ تھی۔ اس قسم میں یہود و مشرکین داخل تھے دوسری قسم دوسرے کنارے پر تھی وہ دنیا اور دنیا کی تمام جسمانی لذتوں کے ترک ہی کو خالص روحانیت سمجھتی تھی اس قسم میں نصاریٰ صابئین اور ہندوستانی بت پرستوں کے چند گروہ داخل تھے۔ ان دونوں قسموں کے مقابلے میں امت اسلامیہ کے لیے اللہ نے ان کے دین میں روح اور جسم دونوں کے حق کو جمع کر دیا۔ دین اسلام تمام حقوق کا جامع ہے اس لیے کہ انسان جسم بھی ہے اور روح بھی حیوان بھی ہے اور فرشتہ بھی گویا اس آیت میں اللہ نے امت مسلمہ کو امت وسط بنانے کی خوشخبری اس معنے میں ہے کہ یہی امت جسم و روح دونوں کے حقوق کی عارف ہو اور دونوں کے کمال تک ارتقاء کرے گی۔

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۔ اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تم کو امت وسط بنایا تاکہ تم حق کے گواہ بنو ان لوگوں پر بھی جو محض مادہ پرست اور دینی پہلو سے تفریط و تقصیر کے مرتکب ہیں اور ان لوگوں پر بھی جنھوں نے اپنے آپ کو محض روحانیت کے حوالے کر دیا ہے۔

کیونکہ یہ لوگ بھی دین میں غلو کرنے والے ہیں تم ان لوگوں کے مقابلے میں بھی گواہی دو گے جو (ان هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ) کے قائل ہیں اور تمہاری گواہی یہ ہو گی کہ ایسے لوگ صرف حیوانیت کی طرف مائل ہیں اور انہوں نے اپنی

انسانی استعداد کو۔ روحانی فضائل و خصوصیات سے محروم ہو کر۔ ختم کر لیا ہے۔ اور تم ان لوگوں کے مقابلے میں بھی گواہی دو گے جو دین میں غلو کرتے ہیں اور جن کا قول یہ ہے کہ انسان کا جسم روح کا قید خانہ ہے اور اس کے لیے عقوبت و سزا ہے اس سزا کے نجات پانے کا طریقہ یہ ہے کہ تمام جسمانی لذتوں سے اپنے کو الگ کر لیں جسم کو سزا دیں اور نفس کو ان چیزوں سے محروم کر دیں جو اللہ نے اس دنیوی زندگی کے لیے مہیا کی ہیں ان لوگوں کے مقابلے میں تمہاری گواہی یہ ہو گی کہ انہوں نے راہ اعتدال چھوڑ دی ہے اور جسموں اور ان کی زندگی بخش قوتوں کو سزا دے کر انہوں نے اپنی روح پر بھی ظلم کیا ہے تم اس گروہ کے خلاف بھی گواہی دو گے اور اس گروہ کے خلاف بھی گواہی دو گے۔ اس طرح تم اپنے اعتدال اور تمام امور میں اپنے توسط کی وجہ سے دنیا کی تمام امتوں سے سبقت لے جاؤ گے کیونکہ جس چیز کی تمہیں ہدایت دی گئی ہے وہ انسانی کمال کا وہ درجہ ہے جس کے بعد کوئی کمال نہیں ہے۔ دین اسلام کا ماننے والا ہر حقدار کا حق ادا کرتا ہے وہ اپنے رب کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق، اپنے جسم کے حقوق، اپنے قرابت مندوں کے حقوق اور تمام انسانوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔

وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا۔ اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی مرتبۂ اعتدال و توسط کی کامل ترین مثال ہیں اور آپ ہی کی سیرت و شریعت کی پیروی کر کے یہ امت امتِ وسط

بن سکتی ہے لوگوں میں کس نے آپ کی سنت کی پیروی کی اور کس نے اپنے لیے بدعت کا راستہ اختیار کیا۔ اس مقدمے کے قاضی و حاکم اللہ کے رسول ہی ہیں جس طرح یہ امت اپنے جسمانی و روحانی ارتقاء کے ذریعہ دوسرے لوگوں کے خلاف گواہی دے گی کہ انہوں نے راہ اعتدال گم کر دی اسی طرح اللہ کے رسول متبع سنت امتیوں کے لیے گواہی دیں گے کہ یہ لوگ ہدایت کی صراط مستقیم پر ثابت قدم رہے گویا اس ٹکڑے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تمہارے لیے اعتدال و توسط کا وصف اسی وقت ثابت و متحقق ہو گا جب تم اپنے عمل کو رسول خدا کی سیرت اور آپ کے اسوہ حسنہ کے مطابق رکھ کر اس کی محافظت کرو گے اور اگر تم نے اس راہ سے انحراف کیا تو رسول خدا اپنی ذات اور اپنے دین و سیرت کے ساتھ تمہارے خلاف اس کی گواہی دیں گے کہ تم ان کی اس امت میں داخل نہیں ہو جن کی تعریف اللہ نے اپنی کتاب کی اس آیت اور (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ) کی آیت میں کی ہے بلکہ تم بدعت کی وجہ سے توسط و اعتدال سے خارج ہو جاؤ گے اور کسی ایک کنارے پر جا پڑو گے جیسا کہ ایک عربی شاعر نے کہا ہے اور زمخشری نے اس آیت کی تفسیر میں اس شعر سے استشہاد بھی کیا ہے۔

وہ محفوظ وسط تھی پھر حوادث نے اسے گھیر لیا یہاں تک کہ وہ ایک کنارہ ہو گیا

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ جب اس آیت میں ایک بڑے عطیہ اور ایک بڑی نعمت کی مہتم بالشان خبر دی گئی ہے تو پھر اس کو تحویل قبلہ کی

گفتگو میں ضمناً جملہ معترضہ کے طور پر کیوں لایا گیا اس کو ابتداءً الگ سے
یا جہاں اللہ نے اپنی نعمتیں شمار کرائی ہیں اس سیاق میں کیوں نہ لایا گیا
اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ تحویل قبلہ کا مسئلہ عنقریب ایک
بڑے فتنے کا سبب بننے والا ہے اور عنقریب اہل کتاب یہ کہتے سنے جائیں
گے کہ محمدؐ اپنے رب کی طرف سے کسی واضح دلیل پر نہیں ہیں اس لیے کہ انہوں نے
اپنا قبلہ بدل دیا اور اگر اللہ نے ان کو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز
پڑھنے کا حکم دیا ہوتا تو پھر وہ دوبارہ اس سے رجوع نہ کرتا اور انہیں اس قبلے
سے نہ پھیرتا جو انبیاء علیہم السلام کا قبلہ ہے اور منافقین کہیں گے کہ انہوں نے
پہلے بیت المقدس کی سمت اہل کتاب کو اپنی طرف مائل کرنے کیلئے نماز پڑھی
پھر ان پر اپنے وطن کی محبت اور اسکی تعظیم غالب آگئی اس لیے وہ پھر کعبے کی طرف
رخ کر کے نماز پڑھنے لگے لہٰذا وہ اپنے دین کے معاملے میں کسی یقین پر نہیں
ہیں بلکہ مضطرب الخیال ہیں۔ اس قسم کے شبہے اشتباہ کرنے والوں کی فکری
بے اعتدالی کی دلیل ہونے کے باوجود مسلمانوں پر اثر انداز ہونے والے
مطمئن اور راسخ الایمان مسلمان دین میں لوگ کے شکوک اور دوسروں کو
شک میں مبتلا کرنے کی وجہ سے محزون و مغموم ہوتے اور ضعیف و غیر راسخ
مسلمان ممکن تھا کہ مضطرب اور متزلزل ہو جاتے یہ سبب تھا کہ اللہ نے
پہلے ہی مسلمانوں کو خبر دے دی کہ تحویل قبلہ کے بعد شکوک اور خبث انگیزی کی ایک
آندھی اٹھنے والی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ان شکوک و شبہات کے مقابلے
کیلئے مسلمانوں کو دلیل و برہان کی تلقین بھی کی اور انہیں یہ بھی بتایا کہ تمام امتوں

کے درمیان ان کا درجہ امت وسط کا ہے جو نہ غلو کرتی ہے اور ظاہری سطح پر رک جاتی ہے، بلکہ ہر حکم کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کوشش کرتی ہے اور انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ تمام امور میں اپنے اعتدال اور دین کے حقائق و اسرار کے فہم کی وجہ سے دوسرے تمام انسانوں پر گواہ اور حجت ہیں دینی حقائق میں سے ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے وہ نماز پڑھتے ہیں اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ اللہ کی طرف توجہ کے وقت تمام اہل ملت کی جہت اور ہیئت ایک ہو۔

چونکہ تمام جہات کی نسبت اللہ کی طرف ایک ہی ہے کیونکہ وہ کسی جہت میں بھی محدود و محصور نہیں ہے اس لیے کسی متعین سمت کے التزام میں اللہ و رسول کے حکم کی پیروی ضروری ہے امر خداوندی کے بغیر بطور خود کسی جہت کی تعیین خواہش نفس کی پیروی اور ایک ایسی تخصیص ہو گی جس کی کوئی دلیل نہ ہو اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ جن کو کوئی معتدل المزاج عاقل اپنے لیے پسند نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ تحویل قبلہ کی حکمت جاننے کی خواہش کر سکتا ہے اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو اس کی حکمتیں بتائیں۔ اس طرح یہ آیت شکوک و شبہات کے گھپ اندھیرے میں ایک روشن چراغ بن گئی جو مسلمانوں کے آگے چلتا ہے اور افراط و تفریط کے درمیان مذہب احمقوں کی احمقانہ تنقید کے مقابلے کے لیے حکمت و بصیرت عطا کرتا ہے۔ بخدا یہ قرآن کی ایسی بلند درجہ بلاغت ہے جس سے بلند کسی درجے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(تفسیر المنار، جلد ۲)

شیخ محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا مصری رحمہما اللہ کی یہ تشریح بہتر اور جامع تشریح ہے۔ اس سے بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں امتِ مسلمہ کو جو منصب عطا کیا گیا ہے، اور قول و عمل، گفتار و کردار دونوں ہی کے لحاظ سے اس کو توسط و اعتدال کے جس مقام کا شاہد بنا کر کھڑا کیا گیا ہے اس کی ذمہ داری کتنی عظیم ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی تازہ کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں لکھتے ہیں:

"امتِ اسلامیہ آخری دینی پیغام کی حامل ہے اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات پر حاوی ہے اس کا منصب قیادت و راہنمائی اور دنیا کی نگرانی و احتساب کا منصب ہے۔ قرآن مجید نے بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

	(اے پیروانِ دعوتِ اسلامی)
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ	تم تمام امتوں میں بہتر امت
أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ	ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح)
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	کے لیے ظہور میں آئی ہے،
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ	تم نیکی کا حکم دینے والے،
بِاللّٰهِ ؕ	برائی سے روکنے والے اور
(آلِ عمران - ۱۱۰)	اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے
	ہو۔

دوسری جگہ کہا گیا ہے :

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا

اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں امتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو ۔

اس لیے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس امت کی کی جگہ قافلہ کے پیچھے اور حاشیہ برداروں کی صف میں ہوا اور وہ دوسری اقوام کے سہارے زندہ رہے اور قیادت و رہنمائی امر و نہی اور دینی و فکری آزادی کے بجائے تقلید اور نقل، اطاعت و سپر اندازی پر راضی اور مطمئن ہو ۔

(ص ۲۰۲-۲۰۱)

سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ کے بارے میں اس جدید دور کے ان علماء کی تفسیر و تشریح کو نقل کرنا میں کافی سمجھتا ہوں ۔ اس آیت کے بارے میں تین سوالات سامنے آتے ہیں :

تین سوالات

(۱) امتِ مسلمہ کو یہ شہادت کہاں دینی ہوگی ، دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ ۔

(۲) کیا اس آیت میں عملی شہادت مراد نہیں ہے ۔

(۳) کیا شہادت (گواہی) صرف قولی ہوتی ہے ؟

اوپر شیخ محمد عبدہ ، رشید رضا اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کی جو رائیں نقل

کی گئی ہیں۔ ان میں تینوں سوالات کے جوابات موجود ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سوال کے بارے میں یہاں تھوڑی سی مزید گفتگو کر لی جائے۔

پہلے سوال کا جواب

پہلے سوال پر امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ ان کی پوری بحث کو یہاں نقل کرنا موجب طوالت ہے۔ اس لیے مختصراً یہاں وہ اقوال پیش کروں گا جن کا ذکر انہوں نے کیا ہے اور پھر ان کا فیصلہ اور محاکمہ نقل کروں گا۔

شہادت دنیا اور آخرت دونوں جگہ دینی ہوگی

اس شہادت کے بارے میں اصلاً مفسرین کے صرف دو قول ہیں؛ ایک یہ کہ اس کا تعلق آخرت سے ہے اور دوسرا یہ کہ دنیا سے ہے۔ امام رازیؒ نے پہلے قول کی دو تقسیمیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ آخرت میں امتِ مسلمہ کو یہ گواہی دینی ہوگی کہ تمام انبیاء سابقین نے اپنی امتوں کو خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ اس امت کو خدا کے نافرمان لوگوں کے ان اعمال کے خلاف گواہی دینی ہوگی جن میں انہوں نے حق کی مخالفت کی تھی۔ اس طرح سب مل کر تین قول بن جاتے ہیں۔ امام رازیؒ کا اپنا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں جس شہادت کا ذکر ہے وہ امتِ مسلمہ کو دونوں جگہ دینی ہوگی۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ

انہوں نے تیسرے قول یعنی دنیوی شہادت کی صحت پر دلیل پیش کرنے کے بعد آخر میں اپنا یہ فیصلہ دیا ہے:

واعلم ان الدلیل	اور جان تو کہ وہ دلیل
الذی ذکرناہ علی صحۃ	جو ہم نے اس قول کی صحت
ھذا القول لا یبطل	پر دی ہے۔ وہ پہلے قولوں
القولین الاولین لا	کو باطل نہیں کرتی۔ اس لیے
نا بینا بھذہ الدلالۃ	کہ ہم نے اس دلیل سے یہ واضح
ان الامۃ ولا بد ان	کیا ہے کہ اس امت کا دنیا
یکونوا شھودا فی الدنیا	میں گواہ ہونا ضروری ہے۔
وھذا لا ینافی کونھم	اور یہ اس بات کے منافی نہیں
شھودا فی القیامۃ	ہے کہ یہ امت قیامت میں
ایضا علی الوجہ الذی	بھی گواہ ہو جس طرح حدیثوں
وردت الاخبار۔	میں ذکر کیا گیا ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۲)

اور واقعہ یہی ہے کہ اخروی شہادت اور دنیوی شہادت میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لیے اس کو آخرت کے ساتھ خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ آخرت میں شہادت کے مقام پر وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے جنھوں نے دنیا میں خود حق کی شہادت دی ہو گی۔ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے پہلے سوال کے تحت یہ مختصر بات بتانے کے لیے پیش کی گئی ہے

کہ اس آیت میں دنیوی شہادت کا قول کوئی نیا قول نہیں ہے بلکہ ماقبل رازی سے اب تک مسلسل نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت بھی مراد ہے بلکہ قیامت میں شہادت علی الناس کے بلند مقام پر امتِ مسلمہ کے وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے جنہوں نے دنیا میں سچائی کی قولی عملی دونوں گواہیاں دی ہوں گی۔

قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت بھی مراد ہے

عن الضحاک۔ فی قولہٖ لِتَکُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَی النَّاسِ یعنی بذٰلك الذین استقاموا علی الھدیٰ فھم الذین یکون شھداء علی الناس الناس لتکذیبھم رسول اللہ وکفرھم بآیات اللہ۔ (ابن جریر)	لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کے قول میں ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہدایت پر ثابت قدم رہے تو وہی لوگ وہاں پر لوگوں پر گواہ ہوں گے۔ ان لوگوں پر جنہوں نے اللہ کے رسول کی تکذیب اور اس کی آیتوں کا انکار کیا ہو گا۔

اس عبارت میں ہمیں تین باتیں مل جاتی ہیں۔ ۱ یہ بھی کہ شہادت علی الناس میں دنیوی شہادت داخل ہے۔ ۲ یہ بھی کہ اس آیت میں عملی شہادت مراد ہے

اور یہ بھی کہ شہادت قولی کے ساتھ عملی بھی ہوتی ہے کیونکہ استقامت علی الہدیٰ سے بلند عمل کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

قرآن کی دوسری آیت سے استدلال

قرآن کے طالب العلم کو یہ بات معلوم ہے کہ قرآن کے ایک مقام کو سمجھنے کے لیے دوسرے مقامات کی تفسیر بھی بڑی کارآمد ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں سورۂ نساء کی آیت ۶۹ پڑھیے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو اللہ و رسول کی
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ	اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ	کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	انعام کیا ہے۔ یعنی انبیاء صدیقین
وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ	شہداء اور صالحین اور یہ بڑے
رَفِيْقًا ط	اچھے رفیق ہیں۔

اس آیت میں شہداء سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کا جواب امام رازیؒ کی زبان سے سنیے:

نقول الشهيد فعيل	ہم کہتے ہیں کہ شہید فعیل
بمعنى الفاعل وهو الذى	کا صیغہ ہے، فاعل کے معنی میں
يشهد بصحته دين الله	اور شہید وہ ہے جو دین اللہ
تارة بالحجة والبيان و	کے حق ہونے کی گواہی دیتا
اخرى بالسيف و	ہے کبھی دلیل و بیان سے اور کبھی

والسنان فالشهداء	سیف وسنان سے۔ تو شہداء وہ
هم القائمون بالقسط	لوگ ہیں جو عدل و انصاف پر
وهم الذين ذكرهم الله	قائم ہیں، اور وہ لوگ ہیں جن
فی قوله شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا	کا ذکر اللہ نے اپنے اس قول میں کیا
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	ہے "اللہ گواہ ہے کہ اس کے سوا کوئی
وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ	الٰہ نہیں ہے" اور اللہ کے راستے
ويقال للمقتول فی سبيل	میں قتل ہونے والے کو شہید اس حیثیت
الله شهيد من حيث	سے کہتے ہیں کہ اس نے اپنی جان
انه بذل نفسه فی نصرة	اللہ کے دین کی مدد میں صرف کی اور
دين الله وشهادته له بانه	اس نے گواہی دی کہ وہی حق ہے اور
هو الحق وما سواه هو الباطل و	اس کے سوا ہر دین باطل ہے اور
اذا كان من شهداء الله بهذا	جب وہ دنیا میں بایں معنے شہداء اللہ میں ×
المعنی كان من شهداء الله فی	میں ہوگا، جیسا کہ اللہ نے کہا ہے اور
الاخرة كما قال وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ	اسی طرح ہم نے تم کو امتِ وسط بنایا
اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی	تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو۔
النَّاسِ (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۲۶۶)	

× ہوگا تو وہ آخرت میں بھی اللہ کے شہداء

امام رازیؒ نے امتِ مسلمہ کے شہداء کی ایک جامع تشریح کی ہے۔ اس سے چند باتیں بوضاحت معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آیت البقرۃ کے شہداء علی الناس اور آیت النساء کے شہداء میں فرق نہیں ہے۔ دونوں سے ایک ہی گروہ مراد ہے اور اس

گروہ میں آیت آلِ عمران کے اولوا العلم بھی داخل ہیں۔ دوسری یہ کہ شہداء اس شخص کو کہتے ہیں جو قول و عمل دونوں ہی سے اللہ کے دین کی حقانیت و صداقت کی گواہی دیتا ہے تیسری یہ کہ مقتول فی سبیل اللہ کو بھی شہید اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ دین اللہ کی حمایت میں جان دے کر اس کے حق اور دوسرے ادیان کے باطل ہونے کی عملی شہادت دیتا ہے اور چوتھی یہ کہ آخرت میں شہدا علی الناس کے مقام پر وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے جنہوں نے دنیا میں خود شہادت حق کا فریضہ انجام دیا ہوگا۔

سورۃ النساء کی اسی آیت کے تحت سید رشید رضا لکھتے ہیں:

تقوم بها حجة اهل الحق على اهل الباطل تكون بالقول و العمل والاخلاق والاحوال فالشهداء هم حجة الله تعالى على المبطلين فی الدنيا والآخرة بحسن سيرتهم وتقدم القول فی ذالك فی تفسير لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (المنار، جلد ۵)	اور میں کہتا ہوں کہ وہ شہادت جس سے اہلِ حق کی اہل باطل پر حجت قائم ہوتی ہے وہ قول، عمل اور اطلاق واحوال بھی سے ہوتی ہے پس شہدا باطل پرستوں پر اللہ کی حجت ہیں دنیا و آخرت میں، اپنے حسن سیرت کی وجہ سے۔ اور یہ بات پہلے لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

یہ عبارت اتنی واضح ہے کہ اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ آیت لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ سے نہ صرف یہ کہ عملی شہادت مراد ہے بلکہ اس کے بغیر قولی شہادت معتبر نہیں۔ نیز یہ کہ عملی شہادت کا قول کوئی الیا فلسفہ

نہیں ہے جواب ایجاد کر لیا گیا ہو۔ اس کے برعکس عملی شہادت کا انکار ایک ایسا قول ہے جو عقل و نقل دونوں کی شہادت سے محروم ہے۔

آیت زیرِ بحث کے اندر کی دلیلیں

مفسرین کی صراحتوں سے قطعِ نظر خود آیت زیرِ بحث میں کئی دلیلیں ایسی موجود دلیں جن سے بلا اشتباہ یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ شہادت سے مراد قولی و عملی دونوں شہادتیں ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ امت مسلمہ کو امتِ وسط اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف قولی شہادت کی بنیاد پر کیا کوئی امت امتِ وسط بن سکتی ہے؟ اور کیا لفظ وسط میں صرف قول کا توسط و اعتدال مراد ہے؟ ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے یعنی نہ کوئی امت محض قولی شہادت کی وجہ سے امت وسط بن سکتی ہے اور نہ لفظ وسط میں صرف قولی توسط و اعتدال مراد لیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ امت مسلمہ جب تک قولی و عملی دونوں شہادتیں نہ دے، امتِ وسط کے لقب سے ملقب نہیں ہو سکتی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں امتِ مسلمہ کو لوگوں پر گواہ قرار دیا گیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امت مسلمہ پر۔ اس سے واضح طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ جس شہادت کے آپ مکلف تھے اسی شہادت کی امت مسلمہ بھی مکلف ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر امت مسلمہ کے لیے صرف قولی شہادت فرض تھی؟ اس کا جواب کتاب و سنت سے واقف کوئی شخص اثبات میں نہیں دے سکتا۔ جب آپ کے لیے ضروری تھا کہ اس دین حق کا عملی نمونہ بھی پیش فرمائیں جو آپ پر اتارا گیا تھا تو آپ کی نیابت میں امتِ مسلمہ پر بھی ٹھیک وہی فرض عاید ہوتا ہے جو آپ پر

پر عائد ہوا تھا۔ تیسری دلیل علی کے صلے میں پوشیدہ ہے۔ لفظ شہید جب علی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اسکے معنے "رقیب" کے بھی آتے ہیں اور رقیب کہتے ہیں محافظ و نگراں کو اس کی واضح نظیر سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں موجود ہے حضرت عیسٰے علیہ السلام اپنا بیان دے رہے ہیں۔

سورۂ المائدہ کی ایک آیت

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ	اور میں ان کا نگراں تھا جب تک ان میں
شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ۔	موجود رہا۔

اس ٹکڑے کی تفسیر صاحب روح المعانی نے یہ کی ہے:۔

ای رقیبا اراعی	یعنی میں ان کا محافظ تھا۔ ان
احوالهم واحملهم على العمل	کے احوال کی نگرانی کرتا اور خود بہ نفس
بموجب امرك من غير	نفیس نہیں تیرے احکام پر عمل کے
واسطة ومشاهدا لاحوالهم	لیے ابھارتا اور ان کے حالات کا
من ایمان وکفر	مشاہدہ کرتا ایمان کی حالت ہو
(روح المعانی)	یا کفر کی۔

حراست، حفاظت اور نگرانی کا تعلق عمل سے ہے قول سے نہیں۔ اس آیت میں شہید کا لفظ عملی گواہ کے لیے استعمال ہوا ہے اور اگر صرف عملی شہادت مرادنہ ہو جب بھی عملی شہادت کا پہلو قولی شہادت سے زیادہ ابھرا ہوا اور نمایاں ہے۔ مَا دُمْتُ فِيهِمْ (جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا) کے ٹکڑے نے یہ بات بھی صاف کردی کہ انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں اپنی امت کے لیے قولی و

عملی گواہ بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ ان کا کام صرف تبلیغ کرنا نہ تھا اور نہ شہادت کے معنے صرف زبانی تبلیغ کے ہیں اگر کوئی شخص عملی شہادت کو اس زمانے کا ایجاد کردہ فلسفہ سمجھتا ہے تو وہ کتاب وسنت سے واقف نہیں ہے۔

ایک حدیث

بخاری کی کتاب التفسیر میں اس آیت کے تحت ایک حدیث ہے جس میں حضرت ابن عباس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبے کا ذکر کیا ہے۔ اس خطبے میں نبی اکرمؐ نے کئی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ امت مسلمہ کے کچھ لوگ جب جہنم کی طرف ہنکائے جا رہے ہوں گے تو حضورؐ کو تعجب ہوگا لیکن فرشتے کہیں گے کہ آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کی وفات کے بعد دین میں کیا نئی بات پیدا کی تھی اور کس طرح اپنا دین بدل دیا تھا یہ سنکر حضورؐ جو کچھ فرمائیں گے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

فاقول کما قال العبد	تو میں کہوں گا جس طرح اللہ کے
الصالح وکنت علیہم شہیدا	نیک بندے نے کہا اور میں ان پر
مادمت فیہم فلما توفیتنی	نگراں تھا جب تک ان کے درمیان
کنت انت الرقیب علیہم۔	رہا پھر جب تو نے مجھے واپس بلا
(بخاری، جلد ۲)	لیا تو ان کا نگراں تو ہی تھا۔

اس حدیث سے واضح کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی امت پر ٹھیک اسی طرح گواہ رہے جس طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام اپنی امت پر رہے تھے اور یہ پہلے معلوم ہو چکا کہ سورہ مائدہ کی اس آیت میں شہادت کا عملی پہلو قولی سے زیادہ نمایاں ہے۔

تیسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا اسی سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں ہوتی بلکہ عملی بھی ہوتی ہے اور کَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کی آیت میں عملی شہادت بھی مراد ہے لیکن بہت سے مسلمات میں بھی شک انگیزی کی رسم عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اس لیے بعض بالکل تسلیم شدہ چیزوں کو بھی از سر نو مدلل کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اسی لیے ایک مستقل سوال کے تحت یہ دکھایا جارہا ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں بلکہ عملی بھی ہوتی ہے پہلے لسان العرب کا ایک قول یہاں نقل کر رہا ہوں۔

عملی شہادت کی مزید دلیلیں

قال ابن الاعرابی: انشدنی اعرابی فی صفة فرس
لہ غائب لم یبتذل وشاھد
قال الشاھد من جریہ
ما یشھد لہ علی سبقہ و جودتہ۔

ابن الاعرابی نے کہا کہ ایک اعرابی نے ایک گھوڑے کی تعریف میں مجھے یہ مصرع سنایا۔
"لہ غائب لم یبتذل وشاھد"
اس نے کہا، گھوڑے کی دوڑ کا شاہد وہ ہے جو اس کی سبقت وجودت پر گواہی دیتا ہے۔

اس مصرع میں گھوڑے کی عمدگی اور اس کی مسابقت پر اس کی رفتار کو گواہ قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رفتار کی شہادت فعلی وعملی شہادت ہی ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ کلام عرب میں شہادت کا لفظ صرف عملی شہادت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے فعلی وعملی شہادت کوئی فلسفہ نہیں بلکہ لغوی استعمال ہے۔ بدوی عرب کے

کلام کے بعد اب کلام اللہ کی دو (۲) آیتیں ملاحظہ کیجئے:

(۱) مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (توبہ ر ۳)	مشرکوں کا کام نہیں کہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہوئے اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔

جب کوئی کافر اپنے کو کافر نہیں کہتا تو پھر کفار قریش کے بارے میں یہ کہنا کس لحاظ سے صحیح ہوگا کہ وہ اپنے کفر کے خود گواہ ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں ہوتی بلکہ عملی بھی ہوتی ہے۔ کفار کے کافرانہ اعمال و احوال ان کے کفر پر گواہ ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے انہیں اپنے کفر پر گواہ قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

شہادتھم على انفسهم بالكفر سجودهم للاصنام وذالك ان كفار قريش قد نصبوا اصنامهم خارج البيت عند القواعد وكانوا يطوفون بالبيت عراة كلما طافوا طوفة سجدوا للاصنام فلم يزدادوا بذالك من الله الا بعدا	اپنے نفوس پر ان کی شہادت کفر یہ تھی کہ وہ اپنے بتوں کو سجدہ کرتے تھے۔ اس طرح کہ کفار قریش نے بیت الحرام سے باہر اس کے گوشوں کے پاس اپنے بت نصب کر رکھے تھے اور وہ برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتے جب ایک طواف پورا کرتے تو اپنے ان بتوں کو سجدہ کرتے۔ پس وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے خدا سے دور ہی ہوتے

چلے گئے۔ (خازن ج)

فعلی وعملی شہادت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا۔ کعبہ جو توحید کا مرکز اور ایک خدا کا گھر ہے۔ اس کو بتوں سے سجانا، اس کا عریاں طواف کرنا اور ان بتوں کو سجدے کرنا کفر و شرک پر ایسی عملی شہادت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے قولی شہادت نہ ہو جب بھی ان کے خود اپنے کفر پر گواہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں آیت کی تفسیر میں تمام اقوال کو پیش کرنا مقصود نہیں۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ حضرت ابن عباس جیسے اہل زبان اور مفسر قرآن نے کفار قریش کے عمل کو "شہادت" قرار دیا۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:۔

(شَاهِدِيْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ) باظهارهم مایدل علیه وان لم یقولوا نحن کفار۔	انہوں نے کفر کی گواہی دی ایسی باتوں کے اظہار سے جو کفر پر دلالت کرتی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم کافر ہیں

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ قولی شہادت نہ ہونے کے باوجود ان کو عملی شہادت کی وجہ سے اپنے کفر پر خود گواہ کہا گیا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:۔

الغرض کفار و مشرکین جو اپنے حال و قال سے اپنے کفر و شرک سے گواہی دیتے رہتے ہیں اس لائق نہیں کہ ان سے مساجد اللہ خصوصاً مسجد حرام کی حقیقی تعمیر (آبادی) ہو سکے۔

(۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ — بلاشبہ انسان اپنے رب کا ناشکرا

لَكَنُوْدٌ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ﴿۷﴾ ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔

یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے اپنی زبان سے ناشکری کا اقرار کب کیا اور اس نے یہ کب کہا کہ میں اپنے رب کا ناشکرا ہوں۔ اس سوال کا جواب بھی یہ ہے کہ اس نے کفرانِ نعمت کی عملی شہادت دی اور اسی شہادت کی بنا پر اس کو ناشکری پر شہید (گواہ) قرار دیا گیا۔

(وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ) اى كنوده (لَشَهِيْدٌ) يشهد على نفسه بصنعه (جلالین)	اور وہ اپنے ناشکرا ہونے پر گواہ ہے۔ وہ اپنے عمل سے اپنے آپ پر اس کی شہادت دیتا ہے۔

مدارک التنزیل میں ہے:

(وَاِنَّهٗ) وان الانسان (على ذٰلِكَ) على كنوده (لَشَهِيْدٌ) يشهد على نفسه	اور بلاشبہ انسان اپنی ناشکری پر گواہ ہے۔

يَشْهَدُ عَلٰى نَفْسِهٖ کے تحت صاحب الکلیل لکھتے ہیں:

ليس المراد بشهادة الانسان على نفسه بالكنود الشهادة بلسان المقال بل المراد الشهادة بلسان الحال	انسان کی اپنے آپ پر ناشکری کی شہادت سے مراد قولی شہادت نہیں بلکہ یہ شہادت بزبانِ حال ہے۔

یہی بات صاحب روح المعانی نے لکھی ہے:

(لشهيد) لظهور اثره عليه فالشهادة بلسان الحال الذى هو افصح من	وہ گواہ ہے اس سبب سے کہ اس پر ناشکری کا اثر ظاہر ہے تو یہاں مراد زبانِ حال کی شہادت ہے جو

لسان المقال۔ زبانِ قال سے زیادہ فصیح ہے۔

اس عبارت سے واضح ہوا کہ عملی وحالی شہادت قولی شہادت سے زیادہ فصیح ہوتی ہے۔ یعنی عملی شہادت سے انسان کی قلبی کیفیت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:۔

وان الانسان علی	اور انسان اپنے ناشکرا ہونے
کونہ کنودا لشہید ای	پر گواہ ہے یعنی بزبان حال یعنی
بلسان حالہ ای ظاہر ذالک	اس کا ظاہر اسی پر ہے اس کے
علیہ فی اقوالہ وافعالہ کما	اقوال میں اور افعال میں جیسا کہ
قال تعالیٰ (ما کان للمشرکین	اللہ نے کہا (مشرکین کا کام نہیں کہ
ان یعمروا مساجد اللہ	وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں بایں
شاہدین علی انفسھم بالکفر)	حال کہ وہ اپنے کفر کے خود گواہ ہیں)

انسان اگرچہ اپنی ناشکری کا زبانی اعتراف نہیں کرتا لیکن اس کے دوسرے اقوال اس کی ناشکری کی دلیل بنتے ہیں اسی طرح اس کے اعمال اس کے ناشکرا ہوتے پر گواہ ہوتے ہیں اور اسی جہت سے اس کو اپنی ناشکری پر گواہ قرار دیا گیا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں:۔

"اکثر مفسرین اس جملے کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ انسان خود اپنی ناشکری پر زبان حال سے گواہ ہے ذرا اپنے ضمیر کی آواز کی طرف متوجہ ہو تو سن لے کہ اندر سے خود اس کا دل کہہ رہا ہے کہ تو بڑا ناشکرا ہے"۔

شہید کو شہید کیوں کہتے ہیں؟ اللہ کی راہ میں جو شخص قتل کر دیا جاتا ہے

اس کو شہید کیوں کہتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی ایسی عملی شہادت پیش کرتا ہے جسے سب سے آخری اور بلند درجے کی شہادت کہنا چاہیے کیونکہ جب کسی انسان نے اپنی جان بھی قربان کر دی تو اب اس کے پاس قربان کرنے کی کوئی اور چیز باقی نہیں رہی۔ اور سورۂ نساء کی آیت ۶۹ کے تحت امام رازی کی تفسیر میں اس کا ذکر گزر چکا ہے لیکن وہاں یہ چیز ضمناً آئی تھی۔ یہاں ہم خاص اس سوال سے متعلق چند اقوال پیش کرتے ہیں:

والشهداء جمع شهيد وهو المقتول في سبيل الله سمي بذلك لقيامه بشهادة الحق في جنب الله حتى قتل (ابن جریر جلد ۵)	شہداء شہید کی جمع ہے اور شہید وہ ہے جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیا گیا ہو۔ اس کا نام شہید اس لیے رکھا گیا کہ وہ اللہ کے معاملے میں شہادت حق پر قائم رہا۔ یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا۔
ثم الشهداء الذين ادى بهم الحرص على الطاعة والجد في اظهار الحق حتى بذلوا مهجهم في اعلاء كلمة الله سبحانه (بیضاوی)	پھر شہداء ہیں وہ لوگ جنہیں طاعت رغبت اور اظہار حق کی سرگرمی نے اس حد تک پہنچایا کہ انہوں نے اللہ پاک کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اپنا خون بہایا اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔

مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:

شہید کے معنی گواہی دینے والا یعنی ایسا انسان جو اپنے قول و عمل سے سچائی

کا اعلان کرنے والا ہو اور دنیا میں اس کے لیے شہادت و حجت قائم کرے"۔

(ترجمان القرآن جلد ۱)

ان چند اقوال سے بھی معلوم ہو گیا کہ شہید کو شہید کہنے میں اس کی عملی شہادت کا وزن زیادہ ہے۔ عملی شہادت کے اثبات کے لیے اتنی تفصیل اس لیے پیش کرنی پڑی کہ جو لوگ قرآن و حدیث اور عربی لغت کا براہ راست علم نہیں رکھتے وہ جان لیں کہ عملی شہادت کوئی فلسفہ نہیں ہے جسے کسی شخص نے ایجاد کر لیا ہو بلکہ اس کا انکار ایک ایسا دعویٰ ہے جسے سن کر حیرت طاری ہوتی ہے۔

شہادت حق کے جس عظیم منصب پر امت مسلمہ سرفراز کی گئی ہے اس کے متعلق دوسری آیت سورۂ حج کے اخیر میں ہے اور جس سیاق و سباق میں ہے اس نے شہادت کے مفہوم کو پوری طرح متعین کر دیا ہے۔ ہم یہاں وہ آیتیں نقل کرتے ہیں:۔

سورۂ الحج کی آخری آیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ	اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور نیکی کرو شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں اس نے تم پر کوئی سخت مشکل نہیں ڈالی۔ دین تمہارے باپ ابراہیم کا۔ اس نے تمہارا نام

مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَکُوْنَ	مسلم رکھا پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی
الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ وَ	تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں
تَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ	پر گواہ ہو پس نماز قائم کرو اور
فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ	زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ
وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰکُمْ فَنِعْمَ	وہ تمہارا آقا ہے بہترین آقا اور
الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ (الحج ۱۰)	بہترین مددگار

سورۂ حج کی یہ دو آیتیں اس شہادت کا مفہوم جس امت مسلمہ جس کی ذمہ دار قرار دی گئی ہے اس طرح متعین کر دیتی ہیں کہ پوری طرح انشراح صدر حاصل ہو جاتا ہے۔ لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس کے درمیان یہ ٹکڑا اس طرح آیا ہے کہ خود پکار کر کہہ رہا ہے کہ امت مسلمہ کو شہادت حق کا جو منصب سپرد کیا گیا ہے وہ پورے دین کی اقامت کا فریضہ ہے۔ راہ خدا میں جہاد کا فریضہ ہے ایسا جہاد جس کا حق ادا کر دیا گیا ہو یہی وہ خدمت ہے جس کے لیے یہ امت منتخب کی گئی ہے اور مسلم کا معزز لقب اس کو اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ لوگوں کے سامنے حق کی شہادت پیش کرے ــــ پہلی آیت میں رکوع و سجود، بندگی رب اور عمل خیر کا حکم دیا گیا ہے اور خاص سے عام کی طرف اور عام سے اعم (سب سے زیادہ عام) کی طرف کلام کو اس طرح ترقی دی گئی کہ پورا دین اس کے دائرے میں آ گیا۔ اور پورے دین پر عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دین باطل کا زور توڑ نہ دیا جائے اس لیے دوسری آیت کی ابتدا ہی میں جہاد کا حکم دیا گیا۔ بہر حال جہاد یہ بہر حال ایک کٹھن چیز ہے اس لیے چند

باتیں ایسی فرمائی گئیں جو بندۂ مومن کے لیئے اس کڑوی چیز کو شیریں اور لذیذ بنادیتی ہیں پہلی بات ھُوَ اجْتَبٰکُمْ کے ٹکڑے میں کہی گئی ہے۔ یعنی کسی اور نے نہیں بلکہ خود تمہارے آقائے ولی نعمت نے تمام نوعِ انسانی میں سے تم لوگوں کو اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا ہے یہ سنتے ہی اطاعت گزار اور آقا سے محبت کرنے والا غلام مسرت و انبساط کے کیف سے جھوم اٹھتا ہے اور اس کیف میں ہمالیہ کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے کی خدمت بھی اسے کٹھن نظر نہیں آتی۔ لیکن مہربان آقا کی طرف سے شفقت سے بھری ہوئی آواز آتی ہے۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ دین میں اس نے تم پر ایسی مشکل نہیں ڈالی جو حرج کی حد تک ہو۔ یہ دوسری بات ہے جس نے راہ خدا میں جہاد اور فرائض کی تعمیل کو آسان بنایا۔ تیسری بات یہ کہی گئی کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم راہِ خدا میں جہاد کے کس درجے پر پہنچے اور حق کے لیے کون سی قربانی ہے جو انہوں نے نہیں دی۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر سعادت مند بیٹوں پر باپ کی وراثت اور ان کی روش کیوں گراں گزرے۔ پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں مسلم کے معزز لقب سے ملقب کیا ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو گویا اس امت کا نام مسلم رکھنے کی غرض یہی شہادت علی النّاس ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ قرآن میں جگہ جگہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کو پورے دین کے اجمالی عنوان کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے اس کے معنے یہ ہوئے کہ فریضۂ شہادت حق کی تکمیل اس وقت ہو سکتی ہے جب پورا دین قائم ہو جائے یہی وجہ ہے کہ

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے حکم کے بعد اعتصام باللہ کا حکم دیا گیا اور بات اس پر ختم کی گئی کہ اللہ ہی تمہارا آقا و مولے ہے یعنی جب تک تمہارا تعلق اللہ سے قوی نہ ہو تم اس پر بھروسہ نہ کرو، اس سے مدد طلب نہ کرو، اور وہ جب تک تمہاری مدد نہ کرے تم شہادت حق اور اقامتِ دین کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔

مفسرین کرام کیا فرماتے ہیں؟

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ان آیتوں کی صاف اور سامنے کی تشریح ہے جس کے لیے مقدمات قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب مزید اطمینان کے لیے ان آیتوں کے متعدد ٹکڑوں کی وہ تفسیریں نقل کرتا ہوں جو مفسرین کرام نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں میں عام طور سے وہی قول نقل کروں گا جسے مفسرین نے خود اختیار کیا ہے۔

مفسر ابن جریر وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

یقول و ذلوا لربکم	کہتا ہے کہ اپنے رب کے فرماں بردار
خضعوا لہ بالطاعۃ	ہو جاؤ اور اس کے سامنے اطاعت
وافعلوا الخیر الذی	کے ساتھ جھک جاؤ اور وہ نیکی کرو
امرکم ربکم بفعلہ	جس کے کرنے کا حکم تمہارے رب نے دیا ہے

تفسیر کبیر میں ہے:۔

اعبدوا ربکم فی سائر	تمام اطاعت و نواہی میں اپنے رب
المامورات والمنہیات	کی بندگی کرو

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِهَادِهٖ کے تحت مفسر ابن جریر لکھتے ہیں:۔

والصواب من القول فی	اس میں صحیح قول ان لوگوں کا ہے
ذٰلک قول من قال عنی بہ	جو یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ
الجهاد فی سبیل اللہ لان	کی راہ میں جہاد ہے۔ اس لیے کہ
المعروف من الجهاد ذالک	لفظ جہاد کا معروف معنے یہی ہے جب
وهو الاغلب علی قول	کوئی شخص جاهدت فی الله
القائل جاهدت فی	کا جملہ استعمال کرتا ہے تو اغلباً اس
اللہ وحق الجهاد هو	سے مراد راہِ خدا ہی کا جہاد ہوتا ہے
استفراغ الطاقة	اور حق جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اس
فیه	میں اپنی پوری طاقت صرف کی جائے

جلالین میں ہے:۔

(وجاهدوا فی اللہ)	یعنی اقامتِ دین کے لیے
لاقامة دینه	جدوجہد کرو۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:

ای باموالکم	یعنی اپنے مال اپنی زبان اور
والسنتکم و	اپنے جسم وجان سے اللہ کی راہ
انفسکم	میں جہاد کرو۔

امام رازیؒ نے اس سلسلے میں چھ اقوال نقل کیے ہیں اور خود جس بات کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے:

والاولی ان یحمل ذالک	اور بہتر یہ ہے کہ اس کو ہر تکلیف

علی کل التکالیف فکل ما امر بہ ونہی عنہ فالمحافظۃ علیہ جہاد { پر محمول کیا جائے۔ پس ہر مامور بہ اور ہر منہی عنہ پر محافظت جہاد ہے۔

صاحب روح المعانی نے پہلے جہاد کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے۔ کفار کے ساتھ جہاد، شیطان کے ساتھ جہاد۔ اور نفس کے ساتھ جہاد۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

والاولی ان یکون	اور اولیٰ یہ ہے کہ یہاں جہاد
المراد بہ ضروبہ الثلٰثۃ	سے مراد اس کی تینوں قسمیں ہوں۔
ولیس ذالک من الجمع بین	اور اس سے حقیقت و مجاز کو جمع کرنا
الحقیقۃ والمجاز فی شیئ	بالکل لازم نہیں آتا اور اسی طرف
والی ھذا یشیر ماروی	اشارہ کرتی ہے وہ روایت جو
جماعۃ عن الحسن انہ قرء	ایک جماعت نے حسن بصری سے منسوب
الآیۃ وقال ان الرجل	کی ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی
لیجاھد فی اللہ وماضرب	اور کہا کہ کوئی شخص راہِ خدا میں
بسیف ویشمل ذالک	جہاد کرتا رہتا ہے حالانکہ اس نے ایک
جہاد المبتدعۃ والفسقۃ	بار بھی تلوار نہیں چلائی اور اس
فانھم اعداء ایضا	جہاد میں بدعتیوں اور فاسقوں
ویکون بزجرھم عن	سے جہاد بھی شامل ہے اس لیے
الابتداع والفسق	کہ وہ بھی دین کے دشمن ہیں اور
	ان سے جہاد یہ ہے کہ ان کو ڈانٹ
(روح المعانی)	ڈپٹ کر بدعت اور فسق سے روکا جائے

صاحبِ تفہیم القرآنؒ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے :۔

جہاد سے مراد محض قتال (جنگ) نہیں ہے بلکہ یہ لفظ جدوجہد اور کشمکش اور انتہائی کوشش کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر جہاد اور مجاہدے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ مزاحمت کرنے والی کچھ طاقتیں ہیں جن کے مقابلے میں جدوجہد مطلوب ہے اور اس کے ساتھ فی اللہ کی یہ قید یہ متعین کر دیتی ہے کہ مزاحمت کرنے والی طاقتیں وہ ہیں جو اللہ کی بندگی اور اس کی رضا جوئی میں اور اس کے راہ چلنے میں مانع ہیں اور جدوجہد کا مقصود یہ ہے کہ ان کی مزاحمت کو شکست دے کر آدمی خود بھی اللہ کی ٹھیک ٹھیک بندگی کرے اور دنیا میں بھی اس کا کلمہ بلند اور کفر و الحاد کے کلمے پست کر دینے کے لیے جان لڑا دے اس مجاہدے کا اولین ہدف آدمی کا اپنا نفس امارہ ہے جو ہر وقت خدا سے بغاوت کرنے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے اور آدمی کو ایمان و طاقت کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے جب تک اس کو مسخر نہ کر لیا جائے باہر کسی مجاہدے کا امکان نہیں۔" (تفہیم القرآن جلد ۳)

ھُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ کی تفسیر میں ابن جریر نے لکھا ہے :۔

یقول ھو اختارکم لدینہ واصطفاکم لحرب اعدائہ والجہاد فی سبیلہ۔	اللہ فرماتا ہے کہ اس نے اپنے دین کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے اور اپنے دشمن سے لڑنے اور اپنے راستے میں جہاد کے لیے چُن لیا ہے۔

آلوسی لکھتے ہیں :۔

(هو اجتباكم) اى هو جل شانه اختاركم لا غيركم سبحانه والجملة مستانفة لبيان علة الامر بالجهاد فان المختار انما يختار من يقوم بخدمته ومن قرب العظيم يلزمه دفع اعدائه ومجاهدة نفسه بترك ما لا يرضاه ففيها تنبيه على المقتضي للجهاد۔

یعنی اس جلیل الشان نے تمہیں منتخب کیا ہے کسی اور نے نہیں۔ حکم جہاد کی علت بیان کرنے کے لیے مستقل جملہ استعمال کیا ہے اس لیے کہ صاحب اختیار جسے چاہتا ہے اپنی خدمت کے لیے منتخب کرتا ہے اور اس کی بارگاہ میں تقریب کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ منتخب غلام اپنے آقا کے دشمنوں کو دفع کرے اور اس کی ناراضیات کو ترک کر کے اپنے نفس سے جہاد کرے لہذا اس جملہ میں علت جہاد پر تنبیہ کی گئی ہے

(هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ) کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ یہ نام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ دوسرے قول کو امام رازیؒ ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں؛

والثانى ان الكناية راجعة الى الله تعالىٰ فروى عن عطاء عن ابن عباس رضى الله عنهما انه قال

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ھو کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے عطار ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ

ان اللہ سماکم المسلمین من قبل ای فی کل الکتب وفی ھذا ای فی القرآن وھذا الوجہ اقرب لانہ تعالیٰ قال لیکون الرسول شھیدا علیکم و تکونوا شھداء علی الناس فبین انہ سماھم بذالک لھذا الغرض وھذا لا یلیق الا باللہ۔ اما الکلام انہ کیف یکون الرسول شھیدا علینا وکیف تکون امتہ شھداء علی الناس فقد تقدم فی سورۃ البقرۃ

(تفسیر کبیر ج ۲۳ ص ۷۳)

نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ پہلی تمام کتابوں اور قرآن میں یہ قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ اللہ نے اسکے بعد کہا تا کہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو تو اللہ نے فرما دیا کہ اس نے ان کا یہ نام اسی غرض کے لیے رکھا ہے اور یہ بات صرف خدا کے لائق ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ رسول ہم پر کیسے گواہ ہوں گے اور آپ کی امت لوگوں پر کیسے گواہ ہوگی تو یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا۔

اس عبارت سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ راجح قول یہ ہے کہ اللہ نے اس امت کا نام مسلم رکھا ہے۔ دوسری یہ کہ مسلم کا لقب اس غرض سے دیا گیا ہے کہ رسول اس امت پر گواہ ہوں اور یہ امت لوگوں پر گواہ ہو۔ تیسری یہ کہ اس آیت میں شہادت کا مفہوم وہی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت میں ہے اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ امام رازیؒ کے نزدیک امت مسلمہ کو یہ شہادت دنیا اور آخرت دونوں جگہ دینی ہوگی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شہادت کے منصب اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے سورۂ حج کی یہ آیتیں کس قدر اہم ہیں۔

سورۂ آل عمران کی دو آیتیں

امت مسلمہ کے مقصد وجود اور اس کے نصب العین کو متعین کرنے والی تیسری اور چوتھی آیتیں یہ ہیں:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے کہ دوسروں کو بھی خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں) پورے کامیاب ہوں گے۔
(آل عمران، ۱۰۴)	(مولانا تھانویؒ)
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط	(اے امت محمدیہ) تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور (خود بھی) اللہ پر ایمان لاتے ہو۔
(آل عمران، ۱۱۰)	(مولانا تھانوی)

یہ دونوں آیتیں مل کر اللہ کی دوسرے کی توضیح و تکمیل کرتی ہیں اور دوسری آیت میں اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا ٹکڑا اس بات پر دلیل ہے کہ اس کا تعلق صرف مسلم

معاشرے سے نہیں ہے، بلکہ امت مسلمہ کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو معروف کا حکم دے اور انہیں منکر سے روکے۔ اس امت کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو درست رکھے، بلکہ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ ان تمام انسانوں کی صلاح و فلاح کی فکر کرے جو دائرہ اسلام سے باہر ہیں ——

علمائے امت ایک طرف تو اس آیت کو امت مسلمہ کے مقصد حیات کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں اور دوسری اس کے عموم کے قائل رہے ہیں کیونکہ ان میں سے کسی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے پورے ٹکڑے کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کر دے۔ لیکن اب اس زمانے میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس کو حذف کر کے آیت پر گفتگو کی جائے اور ثابت کر دکھایا جائے کہ اس آیت کا تعلق صرف مسلم معاشرے سے ہے اور اس کو امت مسلمہ کے مقصد وجود اور نصب العین کی ترجمانی کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ امر و نہی کے معنے کسی کو کسی فعل کا بزور پابند کرنے یا کسی فعل سے بزور روک دینے کے ہیں اور اس کے دائرے میں صرف اعمال ہی نہیں بلکہ عقائد تک داخل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا تعلق غیر مسلموں سے نہیں ہو سکتا کیونکہ انہیں بزور ایمان لانے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔

اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا ٹکڑا

واقعہ یہ ہے کہ اگر اس آیت سے اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے ٹکڑے کو حذف کر دیا جائے اور امر و نہی کے معانی اور ان کے استعمالات کو نظر انداز کر کے ان الفاظ کو صرف بزور پابند کرنے یا روک دینے کے معنے میں لیا جائے تو پھر یہ آیت پورے مسلم معاشرے تک بھی وسیع نہ ہو گی بلکہ اسلامی حکومت کے صرف امراء و حکام تک محدود ہو کر رہ جائے گی

لیکن ظاہر ہے کہ کسی آیت کو سمجھنے اور سمجھانے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔

لفظ امر کے معنی

آیت کی توضیح کے سلسلے میں سب سے پہلی بات سمجھ لینے کی یہ ہے کہ بزور و قوت کی بات تو الگ رہی عربی زبان میں امر کا لفظ صرف حکم دینے ہی کے معنے میں نہیں آتا، بلکہ ترغیب، مشورہ اظہار رائے، دعوت، تعلیم اور نصیحت کے معانی میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے اور یہ استعمالات عربی زبان اور قرآن و حدیث کے طالب علم کے لیے اس قدر مشہور ہیں کہ ان پر لغت اور قرآن و حدیث سے دلیلیں پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں لیکن اس زمانے میں نئے نئے دعوے غیر ضروری کام کرنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ اس لیے محض اختصار سے لفظ امر کے چند استعمالات یہاں دیئے جا رہے ہیں:۔

لغت کی صراحتیں

(۱) لسان العرب میں ہے:۔

خماص - یامرن	دبلے لطیف جسم والی بیل گائیں
باقتناص انما امراد	کاریگروں کو کہتی ہیں کہ ہمیں شکار
انہن یشوقن من راهن	کرو۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ
الی قصیدها واقتناصها	وہ بیل گائیں اپنے دیکھنے والوں کو
وان فلیس لهن امر۔	شکار کا شوق دلاتی ہیں ورنہ تو ظاہر ہے
	ان کا کوئی حکم نہیں ہوتا۔

اس سند سے واضح ہوا کہ شاعر نے اس شعر میں امر کا لفظ تشویق و ترغیب کے لیے استعمال کیا ہے۔

(۲) مفردات امام راغب میں ہے:۔

قال الشاعر — شاعر نے کہا:

امرت نفسی ای امر فعل — میں نے اپنے نفس سے مشورہ کیا کہ کونسا کام کروں:

اس مصرع میں شاعر نے امر کا لفظ مشورہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

(۳) حماسہ میں ہے ۔ قال درید بن الصمۃ

امرتہم امری بمنعرج اللوی — فلم یستبینوا الرشد الا ضحی الغد

علامہ تبریزی نے اس شعر کا معنی یہ بیان کیا ہے:

والمعنی ابدیت لھم	شعر کا معنی یہ ہے کہ میں نے
رایی بمنعرج اللوی لیکونوا	منعرج اللوی (مقام کا نام) میں ان
علی حذر فلم یظھر لھم	کے سامنے اپنی رائے پیش کر دی تھی
رشد قولی الا حین ھجمھم	تاکہ وہ چوکنا رہیں لیکن ان پر میرے قول
العدو فی الضحی	کی صحت اس وقت واضح ہوئی جب
	بوقت چاشت دشمن ان پر چھا گئے۔

معلوم ہوا کہ درید نے اس شعر میں امر کا لفظ اظہار رائے، مشورہ اور اپنے کہے ہوئے قول کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

(۴) قاموس میں ہے:

	امیر بادشاہ کو کہتے ہیں اور
الامیر: الملک وقائد	اندھے کے رہنما کو اور پڑوسی کو اور
الاعمی والجار والمشاور۔	اس کو جس سے مشورہ کیا جائے۔

ان چاروں پر لفظ امیر کا اطلاق اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ امر میں اقتدار

رہنمائی، تعاون اور مشورہ کے معانی پائے جاتے ہیں۔

قرآن کے استعمالات سورۂ شعراء میں ہے:

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ۝ (ر ۳)	فرعون نے اپنے درباریوں سے جو اس کے اردگرد بیٹھے تھے۔ کہا بلاشبہ یہ کوئی بڑا ماہر جادوگر ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے جادو سے تم کو تمہارے ملک سے نکال باہر کرے تو اب تم لوگ کیا صلاح دیتے ہو۔ انہوں نے کہا موسیٰ اور ان کے بھائی کے معاملے کو چند روز تک ملتوی رکھیں اور شہروں میں جادوگروں کے جمع کرنے کو ہرکارے روانہ فرمائیں۔

کون اس سے ناواقف ہوگا کہ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ میں امر کا لفظ صلاح و مشورہ کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ اسی طرح اَرْجِهْ اور اِبْعَثْ کے امر کے صیغے حکم دینے کے لیے نہیں بلکہ اظہار رائے اور مشورہ کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

(۶) سورۂ طور میں ہے:

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ (ر ۲)	کیا ان کی عقلیں ان کو ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ شریر لوگ ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں امر کا لفظ سکھانے اور بتانے کے معنی میں آیا ہے

(۷) مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طاقت نہ تھی۔ اس کے باوجود آپ لوگوں کو نیکی کی جو بات بتاتے تھے اس کے لیے قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کے علاوہ وحی الٰہی نے آپ کو تعلیم معروف کی جو ہدایت کی اس کے لیے بھی امر کا لفظ استعمال کیا۔

وَيَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ	وہ ان کو نیک باتوں کا حکم
وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ	فرماتے ہیں اور بری باتوں سے
(اعراف، ۱۵۷)	منع کرتے ہیں۔
خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ	عفو و درگزر کی عادت ڈالیے
وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ	اور نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجیے اور
(اعراف ۱۹۹)	جاہلوں سے اعراض کیجیے۔

ان آیتوں سے بھی معلوم ہوا کہ امر و نہی کے الفاظ صرف بزور قوت پابند کرنے یا روک دینے کے معنی ہی میں نہیں آتے بلکہ دعوت و تبلیغ، تبشیر و انذار اور تعلیم و ارشاد کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سب سے بڑے معروف کی دعوت دی وہ توحید ہے اور جس سب سے بڑے منکر کے انجام سے ڈرایا وہ شرک ہے۔ حافظ ابن کثیر يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن اھم ذالک	سب سے اہم اور سب سے بڑا
واعظم ما بعثہ اللہ	امر بالمعروف وہ ہے جس کے ساتھ
بہ من الامر بعبادتہ	اللہ نے آپ کو مبعوث کیا کہ لوگوں کو

وحده لا شريك له والنهي
عن عبادة ما سواه كما
ارسل به جميع الرسل
كما قال ولقد بعثنا
فى كل امة رسولا ان
اعبدوا الله واجتنبوا
الطاغوت (تفسير ابن كثير)

صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت
کا حکم دیں اور اس کے ماسوا کی عبادت
سے منع کریں جیسا کہ اس نے اسی دعوت
کے ساتھ تمام رسولوں کو بھیجا، اللہ
فرماتا ہے: اور بیشک ہم نے ہر امت
میں ایک رسول بھیجا کہ اے لوگو! اللہ
کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔

صاحبِ تفسیر مدارک لکھتے ہیں:

بخلع الانداد
وانصاف العباد وعن عبادة
الاصنام و قطيعة
الارحام (مدارک التنزیل)

وہ شرکا سے ترکِ تعلق اور بندگان
خدا کے ساتھ انصاف کا حکم دیتے
ہیں اور بتوں کی پوجا اور قطع رحم سے
منع کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص آپ کی یا کسی بھی نبی کی دعوتِ توحید کو امر بالمعروف کے دائرے سے باہر نکالنے کی بات کہتا ہے تو قطعاً ایک بے دلیل بات کہتا ہے۔

(٨) يَا بُنَيَّ اَقِمِ
الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ
وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ
(لقمٰن ر٢)

بیٹا نماز پڑھا کر اور لوگوں کو
اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور برے
کاموں سے منع کیا کر اور (اس میں
یا کسی اور حالت میں) تجھ پر جو مصیبت
واقع ہو اس پر صبر کیا کر۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہنے کی جو نصیحت کی ہے اس سے کون شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو طاقت و قوت کے ذریعے معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا سبق پڑھا رہے ہیں جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ ہے کہ صرف اپنی اصلاح نہ کرو بلکہ دوسروں کو بھی نیک بننے کی نصیحت کیا کرو اور برائیوں سے انہیں منع کیا کرو اور اس راہ میں جو اذیت اور مصیبت آئے اس پر صبر کرو اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف کی اصطلاح نصیحت اور تلقین خیر کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

(۹) نہایہ میں ہے :

۲ دو حدیثیں

وفی الحدیث امیری من الملئکۃ جبریل ای صاحب امری دولیی وکل من فزعت الی مشاورتہ ومؤامرتہ فھو امیرک

اور حدیث میں ہے حضور نے فرمایا فرشتوں میں میرے امیر جبرئیل ہیں یعنی میرے خاص دوست اور صاحب مشورہ۔ اور ہر وہ شخص جس کے مشورے کی تمہیں ناگزیر ضرورت ہو وہ تمہارا امیر ہے۔

(۱۰) تفسیر المنار میں ہے :

وفی حدیث جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال سید الشھداء حمزۃ ابن عبد المطلب ثم رجل قام الی امام فامرہ ونہاہ

حدیث جابر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شہداء کے سردار حمزہ بن عبد المطلب ہیں پھر وہ شخص جو کسی حاکم کے پاس گیا اور اس کو اللہ کے معاملہ میں حکم دیا اور منع

فی ذات اللہ تعالیٰ فقتلہ علی ذالک (رواہ الحاکم والدیلمی)

کیا تو اس نے اس کو اس امر و نہی کی پاداش میں قتل کر دیا۔

یہ حدیث بھی اس بات پر نص صریح ہے کہ امر و نہی کے معنے کسی کو حکماً پابند کرنے یا روک دینے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ کسی حکمران تک اپنی بات پہنچا دینے کے بھی ہیں خواہ امر و نہی کرنے والے کی بے بسی و کمزوری اس درجہ کی ہو کہ وہ اس کی پاداش میں قتل کر دیا جائے اور کسی تک کلمۂ حق پہنچا دینے ہی کا نام تبلیغ و ابلاغ ہے۔ آپ انبیاء کرام علیہم السلام کی تبلیغ کا قرآن میں مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ انہوں نے اپنی قوم کو اکثر و بیشتر اوقات حق کی تبلیغ صیغۂ امر ہی سے کی ہے۔

امر و نہی کے لیے اقتدار ضروری نہیں

لغت اور قرآن و حدیث کے ان چند دلائل سے بھی یہ معلوم ہو گیا کہ امر و نہی کے لیے اقتدار و قوت نہ لغوی استعمال کے لحاظ سے ضروری ہے اور نہ شرعی اصطلاح کی جہت سے لازمی ہے بلکہ ایک کمزور شہری اپنے اوپر چھائے ہوئے ظالم اقتدار کو بھی امر و نہی کرتا ہے کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے یہی نہیں بلکہ قوت نہ ہونے کے باوجود ظالم اقتدار کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنا افضل جہاد ہے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جانا اعلیٰ درجے کی شہادت۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص امر و نہی کے لیے اقتدار کو ضروری قرار دیتا ہے تو اس کو دھاندلی کے سوا اور کیا کہا جائے گا۔

تفسیر کا ایک اقتباس

مزید اطمینان کے لیے یہاں امام رازی کی تفسیر کا ایک اقتباس دے دینا بھی مفید ہے۔ وہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۴ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اس آیت نے تین چیزوں کا مکلف قرار دیا ہے، سب سے پہلی چیز دعوت الی الخیر ہے۔ پھر امر بالمعروف پھر نہی عن المنکر اور عطف کی وجہ سے ضروری ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے متغائر ہوں۔ پس ہم کہتے ہیں کہ دعوت الی الخیر میں سب سے افضل اللہ کی ذات و صفات کے اثبات اور ممکنات کی مشابہت سے اس کی تنزیہ و تقدیس کی دعوت ہے۔ دعوت الی الخیر کے اس مذکورہ چیز پر مشتمل ہونے کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے اُدْعُ اِلٰی رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ نیز یہ آیت قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْ اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ

اس کے بعد امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:۔

اذا عرفت ھذا فنقول	جب تم نے یہ جان لیا تو ہم
الدعوۃ الی الخیر جنس تحتہ	کہتے ہیں کہ دعوت الی الخیر جنس ہے
نوعان۔ احدھما الترغیب فی	اور اس کے تحت دو نوعیں ہیں ان
فعل ما ینبغی وھو الامر بالمعروف	میں سے ایک کرنے کے لائق فعل کی
والثانی الترغیب فی ترک ما	ترغیب ہے اور وہ امر بالمعروف
لا ینبغی وھو النھی عن المنکر	ہے اور دوسری نہ کرنے کے لائق
فذکر الجنس اولا ثم اتبعہ	فعل کو چھوڑ دینے کی ترغیب ہے اور
بنوعیہ مبالغۃ فی البیان	وہ نہی عن المنکر ہے پس اللہ نے
واما شرائط الامر بالمعروف	پہلے جنس کا ذکر کیا پھر اس کے بعد
والنھی عن المنکر	اس کی دو نوعوں کا ذکر کیا، بیان

فمن صورة فی کتب الکلام | میں مبالغہ کرنے کے لیے باقی ہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرطیں تو وہ کتب عقائد میں مذکور ہیں

(تفسیر کبیر جلد ۲)

اس عبارت سے دو باتیں بصراحت معلوم ہوئیں ایک یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر دعوت الی الخیر ہی کی دو نوعیں ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ جنس کا اس کی ہر نوع میں پایا جانا ضروری ہے بلکہ اس کا خارجی وجود انواع کا محتاج ہوتا ہے مجرد جنس کا خارجی وجود ممکن نہیں۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ دعوت الی الخیر یا تو امر بالمعروف کی صورت میں پائی جائے گی یا نہی عن المنکر کی صورت میں۔ اسی بات کو دوسرے مفسرین نے عام وخاص کی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ وہ دعوت الی الخیر کو عام اور ان دونوں کو خاص قرار دیتے ہیں مسئلے کی اس نوعیت کو دیکھیے اور پھر اس جدید دعوے پر غور کیجیے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر دعوت الی الخیر سے خالی ہے۔

آیت کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ کی مختصر توضیح

اوپر کے دلائل اثبات مدعا کے لیے بالکل کافی ہیں لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خاص اس آیت کی بھی مختصر سی توضیح پیش کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس آیت میں امر ونہی کے الفاظ صرف کسی شخص کو بزور کسی فعل کا پابند کرنے یا اس کے کسی فعل سے روک دینے کے معنے میں لیے جا سکتے ہیں۔

اسکا جواب یہ ہے کہ ان الفاظ کو صرف اس معنے میں محدود کر دینے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ میں اختصار کے ساتھ ذیل میں اس کے وجوہ عرض کرتا ہوں۔

(۱) اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا ٹکڑا اس بات پر دلیل ہے کہ امت مسلمہ کے امر و نہی کا سلسلہ اپنے دائرے سے باہر تک دراز ہے بلکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ امت مسلمہ کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ وہ دوسرے انسانوں کی بھی اصلاح کرے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں خیر امت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ کسی خاص قوم ونسب یا مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہو گی بلکہ اس کا دائرہ عمل سارے عالم کو اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا گویا اس کا وجود ہی اس لیے ہو گا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں جنت کے دروازے پر کھڑا دے۔ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ (حاشیہ بر ترجمہ شیخ الہند)

جلالین کے شارح شیخ سلیمان الجمل لکھتے ہیں:۔

اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۔ ای لنفعهم و مصالحهم یعنی یہ امت لوگوں کے مصالح و منافع کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔

(۲) دائرہ اسلام سے باہر جو لوگ ہیں ان کی صلاح و فلاح اور ان کے منافع و مصالح کی اساس یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں اور دائرہ ایمان و اسلام میں داخل ہو جائیں اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ کسی کو مومن بنانے کے لیے طاقت کا استعمال اور جبر و اکراہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے ان کو سب سے بڑے معروف توحید کا حکم دینے اور سب سے بڑے منکر شرک سے منع کرنے کے معنے یہ ہیں کہ ان کے سامنے قولاً و عملاً اس کی شہادت دے کر ان پر توحید کی خوبیاں اور شرک کی برائیاں واضح کی جائیں۔

(۳) تامرون و تنهون کے صیغے پوری امت مسلمہ کے لیے آئے ہیں۔ اس سے

معلوم ہوا کہ امر ونہی پوری امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کو جو نیکی کا حکم دیں گے اس کا مفہوم وہی ہے جو تواصی بالحق کا ہے۔ جیسا کہ سورۃ والعصر میں کہا گیا ہے۔ ان کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی معروف پر عمل کرانے کے لیے ایک دوسرے پر طاقت کا استعمال کریں۔ یہ حق صرف امراء و حکام کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مسلمان بتلانے، سکھانے اور ترغیب دینے کے باوجود نماز نہیں پڑھتا تو کسی عام شہری کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کو قید کر دے یا کوئی اور جسمانی سزا دے کیونکہ اس معاملے میں سزا دینا حکومت کا کام ہے۔

(۴) کسی منکر کے وقوع سے پہلے اس سے منع کرنے کو نہی عن المنکر کہتے ہیں اور جو منکر ابھی سامنے نہیں آیا اس کو روکنے کی ابتدا طاقت سے کرنا صحیح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے پر حملہ کر کے اس کو زخمی یا قتل کرنے کا ارادہ کر رہا ہو تو اس کو اس منکر سے روکنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ فوراً طاقت استعمال کر دی جائے بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کی جائے، سمجھایا جائے اور جب وہ نہ سمجھے اور حملے پر تل ہی جائے تو پھر اس ظالم کا ہاتھ پکڑ لیا جائے اور طاقت استعمال کر کے اس کو اس منکر سے روکا جائے۔ قرآن نے دو لڑنے والے گروہوں میں پہلے صلح کرانے کا حکم دیا ہے اور جب ان میں کا کوئی گروہ اس کو نظر انداز کر کے دوسرے گروہ کے ساتھ زیادتی پر مصر ہو تو پھر اس سے جنگ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر میں بھی شریعت کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ ابتدا زور و قوت کے ساتھ کی جائے۔

(۵) عام شہریوں کو بھی بعض مواقع پر طاقت کے استعمال کا جو حق شریعت نے دیا ہے

وہ نہی عن المنکر کے لیے نہیں بلکہ تغییر منکر کے لیے دیا ہے اور ان دونوں میں فرق ہے۔
(اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)

(۶) علمائے حق کا اس مسئلے پر اجماع ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امراء و حکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ شریعت نے یہ ذمہ داری ان آحاد مسلمین پر بھی ڈالی ہے۔ جن کے پاس قوت نہیں ہوتی اور مسلمان ہمیشہ یہ کام کرتے اور اس راہ میں سخت مصیبت سہتے چلے آ رہے ہیں۔

اختصار کے ساتھ جو یہ چند وجوہ عرض کیے گئے ان سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ

(الف) اس آیت میں امر و نہی کے الفاظ کو قوت کے ذریعہ کسی کو کسی فعل کا مکلف کرنے یا کسی فعل سے روکنے کے معنی میں محدود کرنا۔

(ب) اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو صرف مسلم معاشرے کے ساتھ خاص کرنا بالکل غلط ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

ایک معروف و مشہور حدیث یہ ہے:-

مَنْ رَأَی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَ ذَالِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (مسلم شریف)	تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر قدرت نہ ہو تو اپنی زبان سے اور اس کی بھی قدرت نہ ہو تو اپنے دل سے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔

اس حدیث کو پیش کر کے اگر کوئی شخص یہ شبہہ پیدا کرے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا

ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل کے سلسلے میں شریعت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو بزور اس کا پابند کیا جائے تو اس کا جواب کیا ہوگا ؟ اس شبہے کا پہلا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں صرف تغییر منکر کے لیے ہاتھ استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس میں کسی معروف کا پابند بنانے کے لیے قوت کے استعمال کی اجازت بالکل نہیں ہے اس لیے استعمالِ قوت میں امر ونہی دونوں کو یکساں قرار دینا حدیث کا تقاضا نہیں ہے بلکہ شبہ پیدا کرنے والے کے ذہن کا تقاضا ہے۔ شریعت نے معروف پر عمل کرانے کے لیے عوام میں سے کسی شخص کو بھی عام لوگوں پہ طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں دی ہے یہ حق اس نے صرف امراء وحکام کو دیا ہے۔ تغییر المنکر میں ہے:

وقال الاستاذ فی الدرس	اور استاد نے درس میں یہاں پر
ھنا یخلطون بین النھی عن	فرمایا لوگ نہی عن المنکر اور تغییر منکر کو
المنکر وتغییر المنکر الذی جاء	جن کا حکم حدیث من رای منکم
فی حدیث من رای منکم	منکرا فلیغیرہ میں آیا ہے خلط ملط
منکرا فلیغیرہ) وھذا شیئ	کر دیتے ہیں۔ تغییر منکر، نہی عن المنکر سے
آخر غیر النھی البتۃ فان النھی	قطعاً ایک علیحدہ شے ہے اس لیے کہ
عن الشیئ انما یکون قبل	کسی شے سے نہی اس کے وقوع میں

۱؎ البتہ والدین اپنی اولاد کو نماز کا پابند بنانے کے لیے یا شوہر اپنی بیویوں کو سرکشی سے باز آنے کے لیے جسمانی سزا دے سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اہل وعیال عام لوگوں میں داخل نہیں۔ اس کے علاوہ اہل وعیال کو سزا دینا بھی شریعت کا اولین تقاضا نہیں ہے بلکہ جسمانی سزا سے پہلے دوسری تدبیریں اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

فعله ولا كان فعا لا واقعا و تحصيلاً للحاصل۔ | آجانے سے پہلے ہوتی ہے ورنہ واقع کو غیر واقع ماننا پڑے گا یا اس کو تحصیل حاصل کہیں گے۔

اس بات کو انہوں نے ایک مثال دے کر سمجھایا ہے۔ کہتے ہیں:۔

مثال کے طور پر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ گھی میں آمیزش کر رہا ہے تو تم پر واجب ہے کہ اس منکر کو بالفعل مٹاؤ اور ہاتھ پکڑ کر اس کو روکو بشرطیکہ تم کو ایسا کرنے کی قدرت ہو۔ استطاعت کو یہاں نص حدیث ہی نے مشروط قرار دیا ہے اور اگر تم کو قدرت نہ ہو تو تم پر زبان سے اس منکر کی تغییر واجب ہے اور یہ زبانی تغییر صرف اس کو زبان سے منع کرنے اور نصیحت کرنے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ تم اس کا معاملہ حاکم تک پہنچاؤ جو تمہاری قدرت سے بڑھی ہوئی قدرت کے ساتھ اس کو روکے گا۔ باقی رہی دل سے تغییر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس مرتکب منکر سے نفرت کرو۔ اور اس کے فعل سے راضی نہ ہو اور نہی عن المنکر کے طریقے کثیر اور اس کے اسالیب متعدد ہیں اور ہر مقام کے لیے بات یکساں نہیں ہوتی۔

شیخ محمد عبدہٗ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر کا موقع کسی منکر کے وقوع میں آجانے سے پہلے تک ہے اور جب کسی منکر کا ارتکاب شروع ہو چکا یا بعض حالات میں اس کی تکمیل ہو چکی ہو تو ایسی صورت میں بشرط قدرت تغییر منکر کا حکم ہے نہ کہ نہی عن المنکر کا اور بعض حالات میں جب کوئی مسلمان کسی منکر کا ارتکاب کر کے فارغ ہو چکا ہو تو نہ اس منکر سے نہی کا موقع رہتا ہے اور نہ تغییر بالید کا، بلکہ صرف تعزیر باقی رہتی ہے جو حکومت

کا حق ہے۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان شراب پی کر فارغ ہو تو اب نہ نہی کا موقع ہے اور نہ طاقت کے ذریعہ تغییر کا، بلکہ صرف سزا دی جا سکتی ہے جس کا موقع کسی عام کو نہیں بلکہ حاکم کو ہے نہی عن المنکر اور تغییر منکر کے مواقع الگ الگ ہیں اور دونوں کا حکم بھی الگ الگ ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر کے عمل کے لیے طاقت کے استعمال کو شریعت کا اولین تقاضا قرار دینا صحیح نہیں اور نہی کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی یہ دونوں آیتیں امت مسلمہ کے مقصد وجود اور اسلامی مشن کی بصراحت تعیین کرتی ہیں اور علمائے امت ہمیشہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا اہم ترین فریضہ قرار دیتے آرہے ہیں۔ اس پہلو سے یہ کوئی نئی بات نہیں کہی گئی بلکہ اس کے خلاف کہی ہوئی بات ایک نئے دعوے کی حیثیت رکھتی ہے۔

بعض انبیائے بنی اسرائیل کا قتل

اس پوری بحث کے خاتمے پر ایک شبہے کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے یہ شبہ ہمارے اگلے مفسرین کو بھی پیش آیا تھا۔ شبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے اس دنیا میں مدد کا وعدہ کیا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کو ان کی قوم نے قتل کر دیا، پھر یہ وعدۂ الٰہی کس طرح پورا ہوا۔ رسولوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ایمان و عمل اور ان کی جدوجہد میں کوئی کوتاہی رہ گئی تھی، یا یہ کہ انھوں نے حصول مدد کی شرط پوری نہیں کی تھی جس کی وجہ سے وہ مغلوب و مقتول ہوئے اس لیے ان کے قتل کی توجیہ کیا ہو گی؟ اس شبہے کے جواب میں مفسرین کرام نے متعدد باتیں ارشاد فرمائی ہیں میں یہاں انھیں نقل کرتا ہوں۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ مفسر ابن جریر طبری نے یہ سوال اٹھایا ہے اور اس کے دو

جواب دیتے ہیں۔

(۱) رسولوں سے وعدہ مدد کی خبر لفظ و صیغہ کے لحاظ سے عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے اور یہ بات لغۃً جائز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انبیاء و رسل کے ہر ہر فرد سے مدد کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔

(۲) مدد کے وعدے کا مطلب یہ ہے کہ رسولوں کو ایذا پہنچانے والوں سے اللہ تعالیٰ انتقام لے گا عام ازیں کہ یہ انتقام رسول کی موجودگی میں لیا جاتے یا ان کی عدم موجودگی میں ان کے بعد اور یہ معلوم ہے کہ یہودیوں کو قتل انبیاء کی پاداش میں سخت سزائیں دی گئی ہیں اور ان سے انتقام لیا گیا ہے، اس لیے وعدۂ الٰہی پورا ہوا۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ حق پرستوں کی مدد متعدد طریقوں سے کی جاتی ہے اس کے بعد انہوں نے سات طریقے تحریر کیے ہیں۔

(۱) حجت اور دلیل سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل و براہین عطا کیے جاتے ہیں وہ ناقابلِ تردید ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے تمام رسولوں اور نبیوں کی مدد کی گئی ہے اور اس لحاظ سے ہمیشہ وہ غالب ہی رہے ہیں۔

(۲) مدح و ثنا اور تعظیم سے، یعنی لوگوں کی زبان پر ان کی مدح و ثنا ہوتی ہے اور دلوں میں احترام۔ اگر کوئی کسی حق پرست کو قتل بھی کر دے تو وہ لوگوں کے دلوں سے اس کا احترام ختم نہیں کر سکتا۔

(۳) مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انبیاء و رسل اور حق پرستوں کے دل نور یقین سے بھر دیئے جاتے ہیں اور وہ ظالموں اور جاہلوں پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں جس

طرح ملائکہ دنیا کی حقیر ترین شے کو دیکھتے ہیں۔

(۴) باطل پرستوں کا استیلاء اور غلبہ دیرپا نہیں ہوتا۔ یعنی لوگ محسوس کر لیتے ہیں کہ اقتدار پر قبضہ ان کا ناروا ہے۔

(۵) حق پرستوں کو اگر اذیت و مصیبت پہنچے تو اس سے ان کے اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۶) ظالم جب مرتے ہیں تو ان کے آثار تک مٹ جاتے ہیں اور حق پرستوں کے آثار ان کی موت کے بعد بھی باقی رہتے ہیں اور لوگ ان کی اقتدا کرتے ہیں۔

(۷) حق پرستوں کی موت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ان کو ایذا پہنچانے والوں سے انتقام لیتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ جواب دیا ہے کہ انبیاء و رسل سے وعدہ بحیثیت مجموعی کیا گیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر کار فتح رسولوں ہی کی ہوگی۔ اگر درمیان میں کسی نبی کو شکست ہو جائے یا اس کو قتل کر دیا جائے تو اس سے اللہ کے وعدے پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

روح المعانی میں حضرت حسن بصریؒ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

وقال الحسن: المراد	اور حسن نے کہا۔ مدد اور غلبہ سے
النصرة والغلبة فی الحرب	مراد یہ ہے کہ جنگ میں ان کی مدد کی
فانه لم یقتل نبی من الانبیاء	جائے گی اور وہ غالب ہوں گے
فی الحرب وانما قتل من قتل	اس لیے کہ کوئی نبی میدانِ جنگ میں قتل
منهم غیلة او علی وجه آخر	نہیں کیا گیا ان میں سے جو بھی قتل ہوا وہ
وان مات نبی قبل النصرة	دھوکے سے یا کسی اور طریقے سے قتل ہوا

ادقتل فقد اجری اللہ تعالیٰ ان ینصر قومہ من بعدہ فیکون فی نصرۃ قومہ نصرۃ لہ۔ (الجزء الثالث والعشرون ۱۵۰)	ہے اور اگر کوئی نبی مدد سے پہلے وفات پا گئے یا قتل کر دیئے گئے تو اللہ نے ان کے بعد ان کی قوم کی مدد کی اس طرح ان کی قوم کی مدد دراصل انہیں کی مدد ہوتی ہے۔

اس زمانے کے بعض اصحاب علم نے نبی اور رسول کے فرق کو سامنے رکھتے ہوئے کہا ہے کہ فتح اور غلبہ کا وعدہ رسولوں سے کیا گیا ہے، انبیاء سے نہیں۔ اس لیے کبھی کوئی رسول قتل نہیں کیا گیا، انبیاء ہی قتل کیے گئے ہیں۔

مؤلف کا جواب

راقم الحروف کے نزدیک اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ نبیوں اور رسولوں سے ایسی نصرت کا وعدہ جس کے نتیجے میں انہیں غلبہ، فتح، دشمنوں کی ایذا رسانیوں سے نجات اور دنیوی کامیابی حاصل ہو کفار و مشرکین اور اللہ کے کھلے باغیوں کے مقابلہ میں کیا گیا ہے اہل کتاب یا بگڑے ہوئے مدعیان اسلام کے مقابلے میں نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے جو بات عرض کی اس کی پہلی شہادت ان آیتوں میں ملتی ہے جن میں رسولوں سے غلبہ و فتح کا وعدہ کیا گیا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ یہ وعدہ کفار و مشرکین سے مقابلے میں کیا گیا ہے میں نے گزشتہ صفحات میں اس طرح کی جو آیتیں پیش کی ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ سورۃ ابراہیم آیت ۱۳ تا ۱۵، سورۃ الصافات آیت ۱۷۱ تا ۱۷۳، سورۃ المومن آیت ۵۱ سورۃ المجادلہ آیت ۲۱۔

سورۃ ابراہیم کی آیتیں خاص طور پر قابل مطالعہ رہی چاہئیں۔ میں یہاں ان آیتوں

کے صرف ترجمے نقل کرتا ہوں۔

"اور آخرکار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے، یا یہ کہ تم ہماری ملت میں پلٹ آؤ۔ تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے اور یہ (وعدہ) اس کے لیے ہے جو میرے حضور میں (جواب دہی کے لیے) کھڑے ہونے اور میری وعید سے ڈرے اور انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (چنانچہ ان کی دعا قبول ہوئی) اور ہر جبار و معاند نے منہ کی کھائی۔"

ان آیتوں نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ کافر قوموں کے مقابلے میں ان کے رسولوں سے یہ صریح وعدہ کیا گیا تھا کہ منکرین حق ہلاک کیے جائیں گے اور ان کی ہلاکت کے بعد ان رسولوں کو زمین میں آباد کیا جائے گا۔

چناں چہ حجت پوری کرنے کے بعد جب رسولوں نے فیصلہ چاہا تو اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس صراحت کے بعد مفسرین کرام کے جوابات تسلی بخش باقی نہیں رہتے ہیں۔ دوسری طرف پورے قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جس میں انبیاء بنی اسرائیل سے یہ وعدہ کیا گیا ہو کہ انہیں اپنی نافرمان قوم پر غلبہ عطا کیا جائے گا یا یہ کہ اس قوم کے ظالم افراد ہلاک کیے جائیں گے اور ان انبیاء کو ان سے بچا لیا جائے گا۔

راقم الحروف کے جواب کی دوسری شہادت واقعات کی شہادت ہے اور وہ یہ ہے کہ جو انبیاء و رسل کفار و مشرکین کی طرف بھیجے گئے ان میں کوئی ایک بھی قتل نہیں کیا گیا بلکہ ان میں سے ہر ایک کو کافروں پر فتح عطا کی گئی ہے اور دشمنانِ خدا کو ہلاک و برباد کیا گیا ہے۔

قتل کے چند واقعات صرف ان انبیا بنی اسرائیل میں ملتے ہیں جو اپنی بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے تھے اور ان میں سے جن کو قتل کیا خود ان کی قوم نے کیا جو کافر و مشرک نہ تھی بلکہ اپنے وقت کی بگڑی ہوئی مسلم قوم تھی حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ علیہما السلام کے قتل کی صراحت قرآن میں نہیں ہے۔ اس میں اجمالی طور پر یہودیوں کے جرائم کی فہرست میں قتل انبیا کا بھی ذکر کیا گیا ہے ——

توریت اور دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے سیدالاحبار اور اپنی قوم کے سب سے بڑے منصب پر فائز تھے اور حکومت بھی کسی کافر کی نہیں بلکہ "اسرائیلی مسلم" ہی کی تھی اور جس حاکم نے ان کو اسرائیلی عبادت گاہ کے سب سے اعلیٰ مقام پر قتل کرایا۔ اس نے ان کی نبوت کا کبھی انکار نہیں کیا یہی صورت حضرت یحیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی جس حکمراں نے ان کو قتل کرایا وہ کوئی کافر نہ تھا اور اس نے اپنی خواہش نفس سے شکست کھا کر جس مقدس انسان کا سر کٹوا کر اپنے دربار کی رقاصہ کے سامنے پیش کیا وہ خود ان کے تقدس کا قائل تھا۔ اور رنج و افسوس کے ساتھ اس نے ان کے قتل کا حکم دیا تھا۔

انبیاءِ بنی اسرائیل کے قتل کی نوعیت

بات دراصل یہ ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کے قتل کی نوعیت باہمی کشت و خون کی تھی، اس کی حیثیت کسی کافر قوم کے مقابلے میں ان کی شکست و مغلوبیت کی ہرگز نہ تھی۔ قرآن کی آیات اور واقعات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی حکمت بالغہ مسلم و کافر کی نزاع اور مسلم و مسلم کی کش مکش کے درمیان فرق کرتی ہے۔ اللہ نے اس کی اجازت کبھی نہیں دی کہ کوئی کافر قوم، اس کے بھیجے ہوئے

کسی رسول کو قتل کر سکے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس دین کی حقانیت پر زد پڑتی جسے دے کر اس نے رسول کو بھیجا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد کافروں کے مقابلے میں بہت قلیل رہی تو حجت پوری ہو جانے کے بعد اس نے اپنی قدرت قاہرہ سے کافروں کو ہلاک کر دیا اور اگر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد اتنی ہوئی کہ وہ میدان جنگ میں مقابلہ کر سکیں تو اس نے میدان جنگ میں ان کی مدد کی اور کافروں نے شکست فاش کھائی۔ بنی اسرائیل کو اگر اللہ کی مشیت نے یہ چھوٹ دے دی کہ وہ آخری دور کے چند انبیاء کو قتل کر دیں تو اس سے اس دین و شریعت کی حقانیت پر کوئی زد نہیں پڑتی جس کے احیاء کی وہ سعی کر رہے تھے بلکہ ان کے خون نے شجر دین کی خشک جڑوں میں نئی تازگی پیدا کر دی۔

انبیاء بنی اسرائیل اور ان کی قوم کے نافرمان افراد کے درمیان جھگڑے کی وہی نوعیت تھی جو امت مسلمہ کے سرکش حکمرانوں اور مجاہد صلحاء و علماء کے درمیان ہے اس امت کے بارے میں اللہ نے اپنے آخری رسول ؐ کی یہ دعا تو قبول کر لی کہ اس پر وہ کسی ایسے مسلم دشمن کو مسلط نہیں کرے گا جو اس کا استیصال کر دے لیکن یہ دعا قبول نہیں کی کہ ان کے درمیان باہمی کشت و خون نہ ہو۔ یہ ایک دوسرے کو قتل نہ کریں اور جیلوں اور قید خانوں میں نہ ڈالیں جس حدیث میں اس دعا کا ذکر ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

عن عبد اللہ بن خباب	عبد اللہ اپنے والد خباب بن الارت
ابن الارت عن ابیہ قال	سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا
صلی رسول اللہ صلی اللہ	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

عليه وسلم صلوٰة فاطالها
فقالوا يا رسول الله صليت
صلوٰة لم تكن تصليها
قال اجل انها صلوٰة
رغبة ورهبة انى سألت
الله فيها ثلاثا فاعطانى
اثنتين ومنعنى واحدة
سألته ان لا يهلك
امتى بسنة فاعطانيها
وسألته ان لا يسلط
عليهم عدوا من غيرهم
فاعطانيها وسألته
ان لا يذيق بعضهم
باس بعض فمنعنيها

هذا حديث حسن صحيح
ترمذی ابواب الفتن
جلد ۲

ایک طویل نماز پڑھی تو صحابہ نے کہا
یا رسول اللہ! آپ نے ایک ایسی نماز
پڑھی جو (عادتاً) نہیں پڑھتے تھے
آپ نے فرمایا ہاں، یہ امید اور
خوف کی نماز تھی۔ اس میں میں نے
اللہ سے تین چیزیں مانگیں۔ اس نے
مجھے دو چیزیں عطا کیں اور ایک چیز
عطا نہیں کی۔ میں نے سوال کیا کہ وہ
میری امت کو قحط عام سے ہلاک نہ کرے
اللہ نے یہ دعا قبول کر لی اور میں
نے اس سے سوال کیا کہ وہ ان
پر کفار میں سے کسی دشمن کو مسلط نہ کرے
اللہ نے یہ دعا بھی قبول کر لی اور
میں نے سوال کیا کہ ان میں سے
بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں کو
جنگ کا مزہ نہ چکھائیں تو اللہ نے یہ
دعا قبول نہ کی۔

اس مضمون کی حدیث ابن ماجہ نے کتاب الفتن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور امام مسلم نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے حضرت

ثوبان کی روایت زیادہ واضح ہے۔ میں اس کا ترجمہ یہاں نقل کرتا ہوں:۔

"حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنی امت کے بارے میں دعا کی کہ وہ اس کو قحط عام سے ہلاک نہ کرے اور نہ اس پر باہر کے کسی ایسے دشمن کو مسلط کرے کہ جو اس کا استیصال کر دے اور میرے رب نے کہا اے محمد جب میں کوئی فیصلہ کر دیتا ہوں تو اسے کوئی رد نہیں کر سکتا اور میں نے تمہاری امت کے لیے تمہیں یہ عطا کر دیا کہ میں اس کو قحط عام سے ہلاک نہیں کروں گا اور اس پر اس سے باہر کے کسی ایسے دشمن کو مسلط کروں گا جو اس کا استیصال کر سکے۔ اگرچہ کرہ ارض کے تمام دشمن اسے مٹانے کے لیے سمٹ آئیں تا آنکہ خود اس امت کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک کریں اور ایک دوسرے کو قید کریں۔" (مسلم شریف جلد ۲، کتاب الفتن)

ان حدیثوں سے یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے باہمی نزاع میں اہل حق کی حفاظت جان کا وعدہ نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس امت کے گمراہ اور نافرمان افراد نے بھی سینکڑوں علمائے حق کو قتل کیا اور اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ ان انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آیا تھا جنہیں ان کی قوم کے گمراہ افراد نے قتل کر دیا۔

میرے جواب کی صحت پر تیسری شہادت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے سب سے آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر ان کی قوم قادر نہیں ہو سکی۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک یہ کہ اس قوم کی اکثریت نے ظلم کھلا ان کی نبوت و رسالت کا انکار کر دیا تھا اور دوسری وجہ یہ بھی کہ اس وقت یہ قوم کا قر رومیوں کی براہ راست غلامی میں زندگی بسر

کر رہی تھی اور اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ رومیوں کی عدالت سے حاصل کیا تھا۔ اس طرح اب مقابلہ اللہ کے رسول اور منکرین حق کے درمیان تھا جب صورت یہ پیش آئی تو ہم یہاں بھی دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ پر وحی بھیجی کہ ہم تمہیں ان منکرین سے بچالیں گے اور تمہاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر فوقیت برتری اور سربلندی عطا کریں گے جنھوں نے تمہارا انکار کر دیا ہے۔

اس تفصیل سے پوری طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء و رسل کی حفاظت جان کا وعدہ الٰہی منکرین حق کے مقابلے میں تھا اور جب بھی ایسی صورت پیش آئی، خدا کا یہ وعدہ پورا ہوا۔

ایک اور سوال

اگر شہادت اور اقامت دین کے مفہوم میں اللہ کے اتارے ہوئے قانون حیات کی تنفیذ و ترویج اور اسی کے مطابق ریاست کی تشکیل داخل ہے تو پھر اس کے معنے یہ ہیں کہ بہت سے انبیاء کرام نے نہ اقامت دین کا کام انجام دیا اور نہ مکمل طور پر حق کی شہادت ہی دی اس لیے کہ وہ نہ کسی اسلامی ریاست کی تشکیل کر سکے اور نہ کوئی حکومت قائم کر سکے۔ مثال کے طور پر حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ کوئی حکومت قائم نہیں کر سکے تھے تو کیا ان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ (نعوذ باللہ) ان کی شہادت حق ناقص تھی۔

حضرت نوحؑ نے اسلامی حکومت قائم کی تھی

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اسلامی حکومت قائم کی تھی، وہ خود اس کے سربراہ تھے اور اس میں وہی قانون نافذ تھا جو ان پر اللہ تعالیٰ نے اتارا تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکے اوپر کے مباحث میں ہم نے قرآن کریم کی صریح آیتوں سے یہ ثابت کیا ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے رسول اس لیے بھیجتا رہا ہے کہ دین شرک مغلوب اور دین توحید غالب ہو۔ ایک ایسی آزاد فضا اور ایک ایسا پاکیزہ ماحول مہیا ہو جس میں دین حق کی مکمل پیروی کی جا سکے اور اس پیروی میں کوئی طاقت مزاحم نہ ہو۔ اس نے اپنے رسولوں کو کفار و مشرکین کے مقابلے میں جب بھی بھیجا ہے اپنی مدد کا وعدہ کر کے بھیجا ہے اور اس وعدے کے ایفا میں کبھی تخلف نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ یہ وعدہ کبھی اس شکل میں پورا ہوا ہے کہ اپنے فرماں بردار بندوں کو ہر مزاحمت سے آزاد کیا ہے اور کبھی اس صورت میں پورا ہوا ہے کہ اپنے فرماں برداروں کے لشکر کو باغیوں کی فوج پر فتح عطا کر کے کفر و شرک کی طاقت کو شکست دی ہے اور ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اپنے رسول کو منکرین حق کے درمیان سے صحیح و سلامت نکال لے گیا ہے اور پھر ان کی پیروی کرنے والوں کو ان کے منکرین پر غلبہ عطا کیا ہے۔ یہ بات بھی بدلائل ثابت کی جا چکی ہے کہ حق پرستوں کو غلبہ اس لیے عطا کیا جاتا ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا دین خود ساختہ ادیان پر غالب اور خدا کا نازل کیا ہوا قانون حیات نافذ اور رائج ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے، کش مکش کرتے رہے اور اذیتیں سہتے رہے، لیکن ان کی سرکش قوم ایمان نہ لائی اور بغاوت پر اڑی رہی۔ آخر کار اللہ کا وعدہ طوفان نوح کی شکل میں نمودار ہوا اور پوری قوم کو بہا لے گیا۔ حضرت نوح اور ان پر ایمان لانے والوں کی کشتی موجوں کے سینے پر سوار رواں دواں رہی یہاں تک کہ طوفان کم ہوا اور وہ کوہ جودی پر جا لگی اور پھر کوہ جودی کے دامن میں وہ ریاست تشکیل پائی جس کے سربراہ خود حضرت نوح علیہ السلام تھے ان کی زندگی میں اور ان کے بعد معلوم نہیں کب تک اس مملکت کا آئین وہ

شریعت تھی جو حضرت نوح علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ تمام انفرادی و اجتماعی معاملات اسی شریعت کے مطابق انجام پاتے تھے۔ پھر یہ کہنا اور سمجھنا کہ حضرت نوح ع کوئی اسلامی ریاست تشکیل نہ دے سکے کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ حضرت نوح ع کی پوری تاریخ محفوظ ہوتی تو ہم ان کی حکومت کے تمام انتظامات کی اسی طرح نشان دہی کر سکتے جس طرح مدنی ریاست کے انتظامات کی کرتے ہیں:۔

اسلامی حکومت کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ اللہ کے تمام احکام پر عمل کرنے کی کامل آزادی حاصل ہو اور اگر کہیں مزاحمت موجود ہو تو وہ ختم ہو چکی ہو۔ اس حکومت کے لیے نہ کسی خاص رقبے کی شرط ہے اور نہ باشندوں کی کسی خاص تعداد کی۔ اگر زمین کے کسی حصہ میں مسلمانوں کا کوئی مختصر خاندان بھی موجود ہے اور وہ اللہ کے ہر حکم پر عمل کر رہا ہے، چاہے اس کا تعلق نماز سے ہو یا چور کا ہاتھ کاٹنے سے اور دوسری کوئی طاقت نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑ رہی ہو تو زمین کا وہ ٹکڑا اسلامی حکومت اور اس خاندان کا نگراں اس کا سربراہ ہے۔

حضرت آدمؑ دنیا کے سب سے پہلے حکمران بھی تھے

ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا اور وہ نیابت یہ تھی کہ وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایات پر خود عمل کریں اور دوسروں سے عمل کرائیں۔ کیا اس نیابت کے دائرے سے حکومت خارج ہے؟ یقیناً خارج نہیں ہے ہم بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ اس دنیا سے اپنا فریضہ نیابت پوری طرح انجام دے کر تشریف لے گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عالم انسانی

کے نہ صرف سب سے پہلے انسان، سب سے پہلے رسول، بلکہ سب سے پہلے حکمران بھی تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کی حکومت کے حدود اربعہ کی تعیین اور اس کے باشندوں کی مردم شماری شروع کردے تو کیا اس کی یہ روش صحیح ہوگی؟ اسلامی حکومت کا رقبہ اور اس کے باشندوں کی تعداد اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہی ہے اس لیے مردم شماری کے کسی خاص پیمانے سے اس کو ناپنا صحیح نہیں ہے جس طرح حضرت یوسف حضرت داؤد حضرت سلیمان اور سیدنا محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اللہ نے حکومت عطا کی تھی حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کو بھی اس نے حکومت عطا کی تھی۔ رقبے اور تعداد کا جزوی فرق حکومت کی حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔

ممکن ہے میرا جواب لوگوں کو نیا معلوم ہو لیکن قرآن نے رسولوں کے بارے میں اللہ کی جس سنت کا ذکر کیا ہے ان کو غالب کرنے کے جو صریح وعدے کیے گئے ہیں اور ایفائے وعدہ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھ لیا جائے تو اس جواب کی صحت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بوجھ اتنا ہی ڈالا ہے جو ان کی قوت و استطاعت کے اندر ہو۔ اس نے کسی کو بھی تکلیف مالایطاق نہیں دی ہے۔ فریضۂ اقامت صلوٰۃ ہو یا فریضۂ اقامت دین، بندے کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کو انجام دینے اور اس کو بروئے کار لانے میں اپنی پوری قوت اور تمام صلاحیت صرف کردے اور اس کی جدوجہد میں کوتاہی نہ کرے۔ اگر اس نے یہ کر لیا تو کامیاب ہے، اس صورت میں بھی کہ اس نے بالفعل اس فریضے کو انجام دے دیا ہو اور اس صورت میں بھی کہ وہ بالفعل اس کو انجام دینے پر قادر نہ ہو سکا ہو جب حقیقت

بہ ہے تو پھر کسی نبی ورسول کی شہادت حق کو ناقص اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ ان میں سے کسی نے جدوجہد میں کمی کی تھی یا کوتاہی برتی تھی لیکن ہمیں کتاب و سنت نے یہ یقینی علم عطا کیا ہے کہ کسی نبی نے بھی شہادت حق یا فریضہ اقامت دین میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اس لیے کسی نبی کی شہادت حق کو ناقص قرار دینے کی ادنیٰ ترین وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ یہ جواب بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے جواب میں عرض کیا واقعہ کے طور پر یہ کہنا ہی صحیح نہیں ہے کہ بہت سے رسولوں نے اسلامی حکومت قائم نہیں کی ہے۔ الجھن اس لیے پیش آتی ہے کہ لوگ لفظِ حکومت بول کر اس سے موجودہ دور کی کسی حکومت کے لوازمات مراد لیتے ہیں۔

ہم پوری شریعت کے مخاطب ہیں

مسلمان جس ملک میں بھی آباد ہوں وہ شریعت اسلامیہ کے تمام انفرادی و اجتماعی احکام کے مخاطب ہیں وہ ان احکام کے مخاطب بھی ہیں جو مکی آیتوں میں نازل ہوئے اور ان احکام کے مخاطب بھی ہیں جو مدنی آیتوں میں نازل ہوئے، نزولِ قرآن کی تکمیل سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامت تک جو گروہ بھی ایمان لایا ہے یا آئندہ لائے گا وہ پورے قرآن کا مخاطب اور تمام کے تمام اسلامی احکام کا ان شروط و حدود کے ساتھ مکلف ہے جو کتاب و سنت نے مقرر کی ہے۔

المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث ما یکون (شرح السیر الکبیر جلد ۴ ص ۱۲۸)

مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اسلام کے حکم کا ملتزم ہے (یعنی اسلامی احکام کی پابندی اس پر لازم ہے)

یہ چھوٹا سا جملہ امت مسلمہ کا ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے آج تک ائمہ دین اور

علمائے امت میں سے کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ یہ بات کوئی امام وقت سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کسی ملک کی مسلمان آبادی شریعت کے اجتماعی احکام کی مخاطب ہی باقی نہ رہے۔ لیکن اس دور میں غلبۂ اسلام اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے کچھ ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جو خود ساختہ باتیں کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے بعض لوگوں نے حدود و تعزیرات کے بارے میں یہ عذر پیش کیا تھا کہ عام مسلمان ان احکام کو نافذ کرنے کے لیے سرے سے مخاطب و مکلف ہی نہیں ہیں بلکہ ان کو نافذ کرنے کے مخاطب و مکلف مسلمانوں کے اولوالامر یعنی حکام ہیں اور چونکہ یہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہے۔ اس لیے ان احکام کو یہاں نافذ کرنے کی ذمہ داری ہی ساقط ہے چلیے چھٹی ملی، عام مسلمان مخاطب نہیں، حکام موجود نہیں اس لیے حدود و تعزیرات کی تنفیذ کا غم پالنے کی ہمیں کیا ضرورت۔ فرشتے آکر اسلامی حکومت قائم کریں گے اور جب وہ کسی مسلمان کے سر پر امامت کا تاج رکھ دیں گے تو اس وقت یہ مسئلہ قابل غور ہو گا۔ اس عذر لنگ کا مفصل جواب مولانا صدرالدین اصلاحی نے اپنی کتاب "فریضۂ اقامت دین" میں دیا ہے دو وجوہ سے یہ عذر اتنا لنگڑا ہے کہ دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ ایک یہ کہ قرآن میں حدود و تعزیرات کے احکام کا مخاطب اولوالامر کو نہیں، بلکہ پوری امت مسلمہ کو بنایا گیا ہے دوسری یہ کہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ کسی ملک کی حکومت دراصل اس ملک کے عوام کی نمائندہ ہوتی ہے، عوام انتشار سے بچنے کے لیے اپنے اختیارات ایک فرد یا چند افراد کے حوالے کر دیتے ہیں اور پھر وہ لوگ ان کی نیابت میں حکومت کے فرائض انجام دیتے ہیں مسلمانوں کے اولوالامر بھی ان کی نیابت

ہی ہیں تنفیذ احکام کے اختیارات استعمال کرتے ہیں۔ اس پہلو سے بھی حدود و تعزیرات کے احکام کی اصل مخاطب پوری امت ہے نہ کہ صرف اولوالامر۔

اب ایک عرصے کے بعد اسی دعوے کو ایک دوسرے دعوے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے دعوے کی شکل ذرا سی بدل گئی ہے لیکن نتیجے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ بنیاد عولے یہ ہے کہ حدود و تعزیرات اور دوسرے اجتماعی احکام کا مخاطب ہے تو پورا مسلم معاشرہ مگر بے اختیار معاشرہ نہیں بلکہ آزاد و بااختیار معاشرہ۔ بے اختیار مسلم معاشرہ شریعت کے اجتماعی احکام کا سرے سے مخاطب نہیں ہے۔ مدعی نے یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ بے اختیار مسلمان اس بات کے بھی مکلف نہیں ہیں کہ وہ حالات کو بدلنے اور اسلامی حکومت کے قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ان کے نزدیک اجتماعی احکام کی نوعیت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا بااختیار معاشرہ وجود میں آجائے تو اس وقت مسلمان ان اجتماعی احکام کے مخاطب و مکلف ہوں گے اس سے پہلے وہ ان کے مخاطب نہیں ہیں

نتیجے کے لحاظ سے یہ موقف اس موقف سے مختلف نہیں ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ پہلے موقف کے حامی نے اولوالامر کو مخاطب قرار دے کر جان چھڑائی تھی اور اس موقف کے موجد نے بااختیار مسلم معاشرے کو مخاطب قرار دے کر علیہ اسلام کی جدوجہد کو غیر ضروری قرار دیا ہے موجد کا لفظ میں نے بالقصد استعمال کیا ہے اس لیے کہ آج تک ائمۂ دین اور علمائے دین میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی ہے۔ اس بہت بڑے دعوے کے لیے بہت بڑی شرعی دلیل کی ضرورت تھی لیکن وہ ہے کہاں؟ اس لیے

اس کو ثابت کرنے کے لیے دو مزید دعوے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اجتماعی احکام مدینہ منورہ میں نازل ہوئے جب کہ مسلمانوں کا با اختیار معاشرہ بن چکا تھا اور ان کی با اختیار سیاسی تنظیم قائم ہو چکی تھی اس لیے ان احکام کا مخاطب با اختیار معاشرہ ہی ہو سکتا ہے دوسرا یہ کہ اجتماعی احکام مثلاً زانی پر حد جاری کرنے کے حکم کی نوعیت وہی ہے جو زکوٰۃ کے حکم کی نوعیت ہے جس طرح زکوٰۃ کا حکم مطلق نہیں بلکہ مقید ہے اس طرح حدود و تعزیرات کے احکام بھی مطلق نہیں بلکہ مقید ہیں یعنی جس طرح زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب نصاب موجود ہو۔ اگر نصاب موجود نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے

اس طرح جب اسلامی حکومت موجود ہو تو

حدود و تعزیرات کو نافذ کرنا واجب ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو واجب نہیں ہے اور جس طرح کوشش کر کے نصاب حاصل کرنا واجب نہیں اسی طرح کوشش کر کے اسلامی حکومت حاصل کرنا بھی واجب نہیں ہے۔ یہ دونوں دعوے خود محتاج دلیل ہیں مگر انہیں کو پہلے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں پہلا سوال یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں اجتماعی احکام کا نازل ہونا اس بات کے لیے دلیل کس طرح بن جائے گا کہ اب ان احکام کے نازل ہو چکنے کے بعد اگر کسی ملک میں مسلمانوں کا معاشرہ بے اختیار ہو جائے اور اس کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار چھن جائے تو وہ اجتماعی احکام کا مخاطب ہی باقی نہیں رہے گا۔ اجتماعی احکام کی مخاطبت کے لیے یہ "قید" کیا کسی آیت میں ہے، کسی حدیث میں ہے کسی امام کا مذہب ہے، کسی عالم و فقیہ کا قول ہے؟ آخر اس قید کی دلیل کیا ہے۔ کیا اس دعوے کے موجد، قرآن کے مطلق احکام کو مقید کرنے کے لیے کسی دلیل شرعی کی

ضرورت نہیں سمجھتے اور اپنے چلیے ہر مسلمان کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ نزول احکام کی زمانی ترتیب کی بنا پر جس مطلق حکم کو چاہے مقید کر دے، اگر وہ اس دعوے کی فتنہ انگیزی کا احساس کرتے تو وہ ہرگز اس کی جرأت نہ کرتے۔

فرض کیجیے، کوئی شخص کہے کہ جن جن انفرادی و شخصی احکام کی خلاف ورزی پر سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان کا دورِ اقتدار میں نازل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا مخاطب و مکلف بھی با اختیار معاشرہ ہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ان شخصی احکام پر عمل کا تعلق ہے اس کے لیے اقتدار کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ مکے میں نازل نہیں ہوئے، مدینے کے دورِ اقتدار میں نازل ہوئے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہو گی۔ چوری، زنا، شراب نوشی کی حرمتیں شخصی احکام ہیں اور یکساں طور سے ہر مسلمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ چوری نہ کرے، زنا نہ کرے اور شراب نہ پیے اور شریعت کے اس مطالبے پر عمل کرنے کے لیے کسی اقتدار حکومت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خمر، قمار، ربوٰا اور نکاحِ مشرکہ کی حرمتیں مکے میں نہیں، بلکہ مدینے کے دورِ اقتدار میں نازل ہوئیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تمام حرمتوں کی خلاف ورزی پر شریعت اسلامیہ نے حدود و تعزیرات مقرر کی ہیں اور ان کی تنفیذ کے لیے اقتدار حکومت کی ضرورت ہے۔ "زانی کو کوڑے مارو" اور "شرابی کو کوڑے مارو" دونوں کے لیے اقتدار چاہیے۔ اکثر و بیشتر حدود و تعزیرات دراصل شخصی احکام ہی کا اجتماعی رخ ہیں اس لیے شریعت نے مناسب نہیں سمجھا کہ بے اختیار معاشرے کو ان شخصی احکام کا مخاطب و مکلف بنائے جن پر اس نے حدود مقرر کی ہیں۔ جب مدینے میں حدود نافذ کرنے کا اقتدار حاصل ہو گیا تب اس نے مسلمانوں کو ان حرمتوں کا مخاطب و مکلف

بنایا۔ لہذا مسلمانوں کا بے اختیار معاشرہ خمر، قمار، ربوٰ اور نکاح مشرکہ کی حرمتوں کا مخاطب و مکلف نہیں ہے۔

اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ان حرمتوں کے مدینے میں نازل ہونے کی وجہ اقتدار نہیں، بلکہ تدریج فی الاحکام کی حکمت ہے تو عرض کیا جائے گا کہ جن احکام پر عمل کرنے کے لیے اقتدار کی ضرورت نہیں ہے وہ تدریجی طور پر مکہ ہی میں کیوں نازل نہ ہوئے وہاں کیا امر مانع تھا؟ مثال کے طور پر تیرہ برس کی مدت میں حرمت خمر کے تدریجی احکام مکہ میں کیوں نازل ہو سکتے تھے جب کہ شراب سے اجتناب کے لیے اقتدار حکومت کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے مدینے کے دور اقتدار ہی کو کیوں منتخب کیا گیا۔ اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اس حرمت کی خلاف ورزی پر حد نافذ کرنے کی قدرت نہ ہو مسلمانوں کو اس حرمت کا مخاطب و مکلف بنانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

دلیل شرعی کے بغیر مطلق احکام مقید نہیں ہو سکتے

غور کیجیے۔ اس استدلال کا کیا جواب ہے،

اور اگر جواب میں کوئی مزید عقلی تیر تکہ چلایا جائے تو پھر اس کے جواب میں دوسرا شخص بھی عقلی تیر تکے چلائے گا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہی نا کہ شریعت کے مطلق احکام کو مقید کرنے کا مسئلہ ایک کھیل بن جائے گا۔

سوچنا چاہیے کہ مفتئ مدعی کے اس بے بنیاد دعوے نے شریعت کے مطلق احکام کو بے دلیل مقید کرنے کا کتنا خطرناک دروازہ کھولا ہے۔

اس نئے دعوے کے ثبوت میں زکوٰۃ کے مسئلے کو بار بار مختلف انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے یہ کوئی بہت بڑا ہتھیار ہاتھ لگ گیا ہو حالانکہ یہ ہتھیار کھس پھسی لکڑی کا ہے، جناب مدعی زکوٰۃ کے حکم کو مقید اور نماز کے حکم کو مطلق سمجھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک کو مقید اور دوسرے کو مطلق سمجھنے کی دلیل کیا ہے۔ قرآن میں جس طرح نماز کا حکم مطلق ہے اسی طرح زکوٰۃ کا حکم بھی مطلق ہے۔ آخر زکوٰۃ کے حکم کو مقید قرار دینے کی کوئی شرعی دلیل تو ہوگی۔ جناب مدعی کو یہ بات معلوم ہی ہوئی کہ زکوٰۃ کے حکم کو مقید حدیث نبوی اور اجماع امت نے قرار دیا ہے۔ کسی مسلمان کی شخصی رائے نے اس کو مقید نہیں قرار دیا ہے۔ مدعی سے ہمارا مطالبہ یہی ہے کہ وہ قرآن کے اجتماعی احکام کو مقید ثابت کرنے کے لیے کوئی شرعی دلیل عنایت فرمائیں۔ کسی دعوے کو بار بار دہرانے سے وہ ثابت نہیں ہو جاتا۔

اصول دین کا ایک متفقہ مسئلہ

اصول دین کا ایک متفقہ مسئلہ یہ ہے کہ شریعت کے مطلق احکام کے اسباب کو حاصل کرنا واجب ہے اس لیے کہ سبب کی حیثیت موقوف علیہ کی ہوتی ہے اور کسی مطلق حکم کے موقوف علیہ کی تحصیل کے وجوب میں عقلمندوں کے نزدیک کسی شبہے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ علمائے امت کے نزدیک حدود و تعزیرات اور شریعت کے دوسرے اجتماعی احکام مطلق احکام ہیں اور ان پر عمل کرنے کے لیے نصبِ امام کی حیثیت سبب اور موقوف علیہ کی ہے اسی لیے وہ نصبِ امام کو واجب کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی مقتدر امام کا تقرر مسلمانوں کے حاکمانہ اقتدار کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد آپ سے آپ واجب قرار پاتی ہے اور یہی وہ چیز ہے۔

الثانی ان الشارع امر	دوسری دلیل یہ ہے کہ شارع نے
باقامة الحدود وسد الثغور	حدود کی اقامت ، سرحدوں کے
وتجهیز الجیوش للجهاد وکثیر	استحکام ، جہاد کے لیے لشکروں کے انتظام
من الامور المتعلقة بحفظ	اور دوسرے بہت سے امور کا حکم
النظام وحمایة بیضة الاسلام	دیا جو حفظ نظام اور اسلامی جماعت
مما لا یتم الا بالامام وما	کی حفاظت سے متعلق ہیں۔ یہ سب
لا یتم الواجب المطلق الا	وہ امور ہیں جو امام کے بغیر تمام نہیں
به وکان مقدورا فهو	ہوتے اور واجب مطلق جس چیز کے بغیر تمام
واجب علی ما مر فی صدر	نہ ہو اور وہ چیز انسان کی قدرت میں
الکتاب ۔(شرح مقاصد بحث امامۃ)	بھی ہو تو وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے ۔

اس عبارت نے دو باتیں بالکل واضح کر دیں ۔ ایک یہ کہ اقامت حدود وغیرہ ایسے احکام ہیں جو امام کے بغیر انجام نہیں دیئے جا سکتے ۔ امام کا وجود ان احکام کی صحیح تعمیل کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ دوسری بات یہ کہ اقامتِ حدود اور اس طرح کے دوسرے احکام واجب مطلق ہیں اور واجب مطلق جس چیز کے بغیر انجام نہ پا سکے وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے ۔ شرط یہ ہے کہ اس موقوف علیہ کا

حاصل کرنا انسان کی قدرت میں ہو ۔ اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے اس سے علماءِ اہل السنۃ میں کسی کو اختلاف نہیں ہے اور اگر کسی غلط اندیش نے کوئی مہمل اعتراض کیا ہے تو انہوں نے اس کا مسکت جواب دیا ہے ۔ چنانچہ شرح مقاصد ہی میں ایک بے معنی اعتراض

جس سے جناب مدعی کو اختلاف ہے۔ اس متفقہ اصول دین کو رد کرنا چونکہ بے عقلی کی بات ہوتی اس لیے انھوں نے یہ آسان نسخہ تجویز کیا کہ شریعت کے اجتماعی احکام کو مقید قرار دے دیں۔ اس کیلئے جب دلیل طلب کی گئی تو زکوٰۃ کے حکم کو پیش کر دیا اور جب یہ سوال سامنے رکھا گیا کہ زکوٰۃ کے مقید ہونے کی شرعی دلیل تو موجود ہے۔ اجتماعی احکام کے مقید ہونے کی شرعی دلیل کیا ہے تو صرف یہی نہیں کہ کوئی شرعی دلیل نہیں دی گئی بلکہ سائل کو نادان کہہ دیا گیا۔

اس روش کا انجام یہی تو ہو سکتا ہے کہ دوسرا شخص کھڑا ہو اور دعوے کرے کہ نماز کا حکم بھی مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔ جناب مدعی دلیل طلب کریں تو وہ زکوٰۃ کے مسئلے کو پیش کر دے گا گویا قرآن کا ہر مطلق حکم صرف اس لیے مقید ہو جائے گا کہ زکوٰۃ کا حکم مقید ہے۔ اللہ تعالےٰ ہر مسلمان کو دینی مسائل ہیں اس مہلک کھیل سے محفوظ رکھے اور

شرح مقاصد کی دو عبارتیں

واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی احکام کو مقید قرار دینے کے لیے قرآن و حدیث میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ علمائے امت ہمیشہ انہیں مطلق مانتے آئے ہیں۔ عقائد و کلام کی کتابوں سے بیسیوں عبارتیں اس کی تائید میں نقل کی جا سکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے میں صرف شرح مقاصد کی دو عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ نصب امام کے شرعی وجوب کی دوسری دلیل دیتے ہوئے لکھا گیا ہے:۔

الثاني ان الشارع امر
باقامة الحدود وسد الثغور
وتجهيز الجيوش للجهاد وكثير
من الامور المتعلقة بحفظ
النظام وحماية بيضة الاسلام
مما لا يتم الا بالامام وما
لا يتم الواجب المطلق الا
به وكان مقدورا فهو
واجب على ما مر في صدر
الكتاب (شرح مقاصد بحث امامة)

دوسری دلیل یہ ہے کہ شارع نے
حدود کی اقامت، سرحدوں کے
استحکام، جہاد کے لیے لشکروں کے انتظام
اور دوسرے بہت سے امور کا حکم
دیا جو حفظ نظام اور اسلامی جماعت
کی حفاظت سے متعلق ہیں، یہ سب
وہ امور ہیں جو امام کے بغیر تمام نہیں
ہوتے اور واجب مطلق جس چیز کے بغیر تمام
نہ ہو اور وہ چیز انسان کی قدرت میں
بھی ہو تو وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔

اس عبارت نے دو باتیں بالکل واضح کر دیں۔ ایک یہ کہ اقامت حدود وغیرہ ایسے احکام ہیں جو امام کے بغیر انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ امام کا وجود ان احکام کی صحیح تعمیل کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اقامتِ حدود اور اس طرح کے دوسرے احکام واجب مطلق ہیں اور واجب مطلق جس چیز کے بغیر انجام نہ پا سکے وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس موقوف علیہ کا

حاصل کرنا انسان کی قدرت میں ہو۔ اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے اس سے علماء اہل السنۃ میں کسی کو اختلاف نہیں ہے اور اگر کسی غلط اندیش نے کوئی مہمل اعتراض کیا ہے تو انہوں نے اس کا مسکت جواب دیا ہے۔ چنانچہ شرح مقاصد ہی میں ایک بے معنی اعتراض

اور اس کا جواب مذکور ہے:۔

لا یقال الامر باقامۃ	یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ
الحدود کقطع السارق	اقامتِ حدود کا حکم مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا
مثلا ان کان مشروطا بوجود	اگر وجود امام کے ساتھ مشروط ہے تو ہاتھ
الامام لم یکن مطلقا فلم	کاٹنے کا حکم مطلق نہ ہو۔ لہٰذا امام کا
یستلزم وجوبہ کالامر	تقرر واجب نہ رہا جیسے زکوٰۃ کا حکم
بالزکوٰۃ بالنسبۃ الی تحصیل	تحصیل نصاب کی نسبت سے اور اگر
النصاب وان لم یکن مشروطا	وجود امام کے ساتھ مشروط نہیں ہے
بہ فظاہر (شرح مقاصد)	تو ظاہر ہے کہ امام کا تقرر واجب نہ ہوگا۔

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ اگر حدود و تعزیزات کے حکم کو وجود امام کے ساتھ مشروط مانتے ہیں تو پھر یہ حکم مطلق نہیں رہا اور جب مطلق نہ رہا تو پھر نصب امام واجب نہ ہوگا کیونکہ امام کا تقرر تو اس وقت واجب ہو سکتا ہے جب اقامت حدود کا حکم مطلق ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ زکوٰۃ کا حکم وجوب نصاب کے ساتھ مشروط ہے لیکن نصاب کی تحصیل کسی مسلمان پر واجب نہیں ہے۔ اور اگر وہ اقامت حدود کے حکم کو وجود امام کے ساتھ مشروط نہیں مانتے۔ تب تو ظاہر ہے کہ امام کا تقرر مسلمانوں پر واجب نہ ہوگا۔ اس اعتراض کو پڑھ کر راقم الحروف کو احساس ہوا کہ ہمارے نئے مدعی نے اجتماعی احکام کو مقید قرار دینے کے لیے زکوٰۃ کی مثال اسی اعتراض سے لی ہے لیکن اہل السنۃ والجماعۃ کی طرف سے اس کا جو جواب دیا گیا ہے اس کو انہوں نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

لانا نقول فرق	یہ اعتراض اس لیے نہیں کیا جا سکتا
بین تقیید الوجوب و	کہ ہم (اہل السنۃ والجماعۃ) کہتے ہیں کہ
تقیید الواجب نہٰهنا	وجوب کے مقید ہونے اور واجب کے
الوجوب مطلق ای لم	مقید ہونے میں فرق ہے تو یہاں
یقید ولم یشترط بوجود	(جس مسئلے میں بحث ہو رہی ہے) وجوب
الامام والواجب ای	مطلق ہے یعنی وجود امام کے ساتھ
المامور بہ مشروط بہ	مقید و مشروط نہیں ہے اور واجب
وموقوف علیہ کوجوب	یعنی مامور بہ (جس چیز کا حکم دیا گیا
الصلوٰۃ المشروطۃ	ہے) وجود امام کے ساتھ مشروط اور
بالطہارۃ واما فی	اس پر موقوف ہے ان احکام کے
الزکوٰۃ فالوجوب	وجوب کی مثال ایسی ہے جیسے نماز
مشروط بحصول النصاب	کا وجوب جو طہارت کے ساتھ مشروط
حتی اذا انتفی فلا	ہے اور زکوٰۃ میں خود اس کا وجوب
وجوب ۔	ہی حصولِ نصاب کے ساتھ مشروط
	ہے یہاں تک کہ اگر نصاب نہ ہو تو
	زکوٰۃ کا وجوب ہی نہ ہوگا ۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ معترض نے وجوب کے مقید ہونے اور واجب کے مقید ہونے کا فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ اعتراض کیا ہے ۔ فرق یہ ہے کہ حدود کا وجوب امام کے وجود کے ساتھ مقید و مشروط نہیں ہے بلکہ مطلق ہے ۔ ہاں اقامتِ حدود

کے لیے امام کا وجود شرط اور موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً چوری کی حد قطع ید کا وجوب، وجود امام کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ اگر امام موجود نہ ہو تو یہ وجوب ساقط ہو جائے۔ ہاں اس حد کی اقامت و تنفیذ وجود امام کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر امام موجود نہ ہو تو کوئی عام آدمی اس، حد کو نافذ نہیں کر سکتا۔ اس کو یوں سمجھو جیسے نماز کا وجوب جس کی صحتِ ادا طہارت کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر طہارت حاصل نہ ہو تو نماز کا وجوب ساقط نہیں ہوتا۔ ہاں طہارت کے بغیر نماز صحیح نہ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ جس طرح فریضۂ صلوٰۃ کی ادائیگی کے لیے طہارت کی تحصیل واجب ہے اسی طرح فریضہ حدود کی اقامت کے لیے امام کا تقرر واجب ہے بخلاف زکوٰۃ کے۔ وہاں شریعت نے زکوٰۃ کے وجوب ہی کو حصول نصاب کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے۔ اگر نصاب موجود ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر موجود نہ ہو تو اس کا وجوب ساقط ہو جائے گا۔ اجتماعی احکام کی مشابہت نماز کے ساتھ ہے زکوٰۃ کے ساتھ نہیں معترض نے ان کو زکوٰۃ کے ساتھ مشابہ قرار دیا ہے۔

اس جواب سے پوری طرح واضح ہوا کہ اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک شریعت کے اجتماعی احکام (مثلاً حدود و تعزیرات) اس طرح مطلق ہیں جس طرح نماز کا حکم مطلق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان احکام کو مقید کرنے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اب اگر کوئی شخص ان اجتماعی احکام کو مقید قرار دیتا ہے تو وہ ایک بالکل بے دلیل بات کہتا اور اہل السنۃ والجماعۃ کے متفقہ مسلک کے خلاف مسلک اختیار کرتا ہے اور دین میں ایک سخت فتنے کا دروازہ کھولتا ہے

کیا ہم اقامتِ صلوٰۃ کی تکمیل کر رہے ہیں:

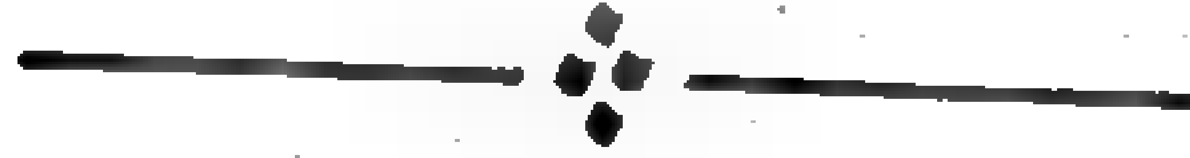
؟شریعت کے بہت سے ہم

تو ایسے ہیں کہ آج ہم ناقص حد تک بھی ان کی تعمیل نہیں کر سکتے لیکن جن فرائض کو ادا کر کے ہم میں کے بہت سے افراد مطمئن ہو بیٹھے ہیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے ہمارے روزے اور ہماری نمازیں بھی مکمل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ علماءِ امت نے امام المسلمین کے فرائض کی فہرست میں ارکانِ اربعہ کی اقامت کو بھی داخل کیا ہے۔ کسی کتاب میں اقامۃ الجمعۃ والاعیاد واخذ الصدقات (جمعہ اور عیدین کی اقامت اور زکوٰۃ کی تحصیل) کے الفاظ آئے ہیں اور کسی میں اقامت ارکان الاسلام کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ احادیث میں آتا ہے کہ جب تک امام اقامتِ صلوٰۃ کرتا رہے اس کے خلاف بغاوت صحیح نہیں۔ معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ امام کے اہم فرائض میں شامل ہے۔

ارکان اسلام کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ آئمۂ صلوٰۃ، محصلین زکوٰۃ اور امیرالحج کا تقرر اسی طرح رمضان کے روزوں اور عیدین کی نماز کے لیے رویت ہلال کی شہادت قبول کرنے والے قاضیوں کا تقرر امام خود یا اپنے نائبین کے ذریعہ کرے گا اور یہی تقرر شرعاً صحیح ہوگا۔

اس تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ ارکانِ اربعہ کو ہر پہلو سے محض انفرادی احکام کا درجہ دیتے ہیں، ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ آج ہم جن اماموں کے پیچھے نمازیں ادا کر رہے ہیں اور جن مفتیوں کے فتووں پر روزے رکھ رہے ہیں یہ ان فرائض کو ادا کرنے کی اعلیٰ نہیں بلکہ ادنیٰ — اور کامل نہیں بلکہ ناقص شکل ہے۔ خلافت کا اقتدار صرف اقامت حدود ہی کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ اقامتِ ارکانِ اربعہ کی تکمیل کے لیے بھی ضروری ہے۔ جو لوگ

اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ اسلام کی جدوجہد سے الگ رہ کر اپنی نمازوں اور روزوں کو مکمل سمجھ رہے ہیں اور اس پر مطمئن ہیں، انہیں غور کرنا چاہیئے کہ ان کا یہ اطمینان صحیح ہے یا غلط ؟



ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صورت

بعض لوگ ایسا سمجھ سکتے ہیں کہ جب تک ہم خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یا اسلامی حکومت بالفعل قائم نہ کر دیں اس وقت تک اقامتِ دین کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

ایک مسلّمہ اصول

لیکن ایسا سمجھنا دین کے ایک مسلّمہ اصول سے غفلت کا نتیجہ ہو گا۔ وہ مسلّمہ اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر حکم کے سلسلے میں بندے کی اصل ذمہ داری یہ قرار دی ہے کہ وہ اسے انجام دینے کی سعی کرے اور اس سعی میں اپنی حدِ استطاعت تک کوتاہی نہ کرے۔ اگر اس نے سعی کر لی تو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان جب تک کسی حکم کی تعمیل میں کامیاب نہ ہو جائے اور بالفعل اس پر عمل نہ کرے اس وقت تک وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہوگا۔ انہیں اپنے خیال کی تصحیح کر لینی چاہیے اس اصول کو دین کے ایک دوسرے مسلّمہ اصول سے تقویت ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان پر اتنی ہی ذمہ داری عاید کرتا ہے جو اس کی حدِ استطاعت

کے اندر ہو وہ کسی پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جسے وہ اٹھا نہ سکے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (بقرہ ر۴۰)

اللہ تعالیٰ ہر نفس پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتا ہے جو اس کی حدِ استطاعت میں ہو۔

اس اصول سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ کوئی انسان کسی ایسے حکم کا مکلف نہیں ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ دوسری یہ کہ جس حکم کا مکلف ہے اس میں بھی اس کی ذمہ داری اسی حد تک ہے جو اس کے مقدور کے اندر ہو۔ اللہ کا تقویٰ تمام دینی احکام کی روح ہے اور اتَّقُوا اللّٰہ (اللہ کا تقویٰ اختیار کرو) کے حکم سے قرآن بھرا ہوا ہے لیکن اس کلی اور جامع حکم کی تعمیل کا مطالبہ بھی بندے کی استطاعت کے اندر ہی ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (تغابن ر۲)

پس (اے مسلمانو!) جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔

اگر مومن اپنی استطاعت کی حد تک تقوےٰ اختیار کر لے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے تقوےٰ کا حق ادا کر دیا۔ یہی بات ہے جو سورہ آلِ عمران میں کہی گئی ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آلِ عمران ر۱۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ حق ہے ڈرنے کا۔

ظاہر ہے کہ کسی کے حق کی ادائیگی استطاعت کے اندر ہی ممکن ہے اس سے باہر نہیں ــــ جزوی احکام میں بھی بندے کی مزید تسلّی و تسکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے استطاعت کی قیدیں لگائی ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا ہے:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔ (الانفال ر ۸)

اور دشمنوں سے مقابلے کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے قوت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے مہیا رکھو۔

جب فرضیت حج کا حکم نازل ہوا تو اس میں بھی استطاعت کی قید لگائی گئی۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط (آل عمران ر ۱۰)

اور لوگوں پر فرض ہے کہ وہ خدا کے لیے خانہ کعبہ کا حج کریں جس کو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔

اسی طرح متعلقہ بیوی کی رہائش کے لیے گھر مہیا کرنے اور بچے کی پرورش کا خرچ برداشت کرنے کے احکام دیتے ہوئے کہا گیا ہے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ (الطلاق ر ۱)

متعلقہ عورتوں کو (عدت) کے لیے اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو، جہاں تم خود رہو۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ ط لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط

جس کو وسعت ہو اس کو چاہیے کہ اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی آمدی نپی تلی ہو وہ جتنا اس کو خدا نے دیا ہے اسی کے مطابق خرچ کرے۔ خدا نے جس کو جتنا دے رکھا ہے اس سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے احکام میں اسی اصول کی توضیح کی ہے :-

ثبت فی الصحیحین عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا امرتکم بامر فاتوا منہ ما استطعتم وما نھیتکم عنہ فاجتنبوہ۔ (ابن کثیر جلد ۴ صد ۲۷۶)	بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو جہاں تک تمہارا بس چلے اسے انجام دو۔ اور جب کسی چیز سے روک دوں تو اس سے اجتناب کرو۔

صحابہ کرام سے سمع و طاعت کی بیعت لیتے وقت حضورؐ اپنی طرف سے یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ سمع و اطاعت کا یہ معاہدہ تمہاری استطاعت کے اندر ہے اس سے باہر نہیں ہے۔

عن ابن عمرؓ قال كُنّا نُبَايِعُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ والطَّاعَۃِ فَيَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُمْ (ترمذی ابواب السیر)	حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپ ہم لوگوں سے فرماتے یہ سمع و اطاعت انہیں چیزوں میں ہے جو تمہاری استطاعت کے اندر ہوں۔

اُمیمۃُ بنتُ رُقیقۃ	حضرت امیمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے
تقولُ بایعتُ رسولَ اللّٰہ	عورتوں کی ایک جماعت میں رسول
صلّی اللّٰہُ علیہِ وسلّم فی	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی
نسوۃٍ فقال لنا فیما	تو آپؐ نے ہم لوگوں سے فرمایا یہ بیعت
استطعتنّ واطقتنّ قلتُ	ان چیزوں میں ہے جو تمہاری استطاعت
اللّٰہُ ورسولُہٗ ارحمُ	اور طاقت کے اندر ہوں۔ میں نے کہا
بنا منّا بانفسنا۔	کہ اللہ اور اس کے رسول ہم پر خود ہم
(ترمذی، ابواب السیر)	سے زیادہ مہربان ہیں۔

کتاب وسنت کے ان نصوص نے بندۂ مومن کے دل میں یہ اطمینان پیدا کر دیا کہ اللہ و رسول کی طرف سے اس کو کسی ایسے امر کا مکلف نہیں بنایا جائے گا جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ نیز یہ کہ وہ جس امر کا بھی مکلف بنایا جائے گا اُس کی انجام دہی میں اس کی حدِ استطاعت کا لحاظ رکھا جائے گا۔

شرعی فرائض کی ایک قسم

کچھ شرعی فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق مکلف و مامور انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے یعنی وہ بذاتِ خود مامور ہوتا ہے کہ ان پر عمل کر کے انہیں بروئے کار لائے اور شریعت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔ مثال کے طور پر فریضۂ صلوٰۃ کو سامنے رکھیے۔ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے سب سے پہلی چیز جو کسی مامور پر واجب ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ ادا کرنے کا اہتمام اور اس کے لیے سعی کرے۔ اگر اس نے سعی کر لی اور کسی ایسے مانع کی وجہ سے نماز ادا نہ کر سکا جس پر اسے قابو نہ تھا تو اسکی ذمہ داری

پوری ہوگئی اور وہ آخرت کی باز پرس سے بچ گیا۔ فرض کیجئے کوئی مسلمان کسی وقت کی نماز کا پورا اہتمام کر کے جماعت سے نماز ادا کرنے کے لیے گھر سے روانہ ہوا اور راستے میں کسی حادثے کا شکار ہوکر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس صورت میں نہ صرف یہ کہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگیا مگر اس وقت کی نماز کا اجر بھی اُسے مل گیا حالانکہ بالفعل اس نے وہ نماز نہیں پڑھی۔ دوسری چیز یہ کہ فریضہ صلوٰۃ کی جس حد تک ادا کرنے کی اس میں استطاعت ہوگی اسی حد تک وہ مکلف ہوگا۔ اگر وہ کھڑے ہوکر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ کر ادا کرے گا اور بیٹھ کر بھی ادا نہیں کر سکتا تو لیٹ کر اشاروں سے ادا کرنے کا مکلف ہوگا۔ سعی و کوشش کے بعد ذمہ داری سے عہدبرآ ہو جانے اور مستحق اجر ہونے کی صراحت ذیل کی آیت میں ہے۔

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ	اور جو شخص نکلتا ہے اپنے گھر
مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	سے اللہ و رسول کی طرف ہجرت
ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ	کے ارادے سے پھر (راستے میں)
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى	اسے موت آ جاتی ہے تو اس کا اجر
اللّٰهِ۔ (النساء ۱۴)	اللہ کے یہاں ثابت ہو گیا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک صحابی مکے سے ہجرت کر کے مدینے جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے، لیکن ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ مقام تنعیم میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جب مدینے اس کی خبر پہنچی تو صحابہؓ نے کہا! کاش وہ مدینے پہنچ کر مرتے تو انہیں پورا اجر ملتا۔ اس کے بعد مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس سے واضح کردیا گیا کہ انہیں پورا اجر مل گیا۔ پورا اجر ملنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے

اپنی ذمہ داری پوری کرلی تھی۔ احادیث رسولؐ نے توضیح کردی ہے کہ یہ حکم صرف ہجرت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من خرج حاجا فمات کتب لہ اجر الحاج الی یوم القیٰمۃ و من خرج معتمرا فمات کتب لہ اجر المعتمر الی یوم القیٰمۃ ومن خرج غازیا فمات کتب لہ اجر الغازی الی یوم القیٰمۃ۔

(الترغیب والترہیب بحوالہ ابو یعلیٰ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جو مسلمان) حج کے ارادے سے نکلا (پھر راستے) میں مرگیا تو ان کے لیے قیامت تک حج کرنے والے کا اجر لکھا جاتا رہے گا اور اور جو عمرے کے ارادے سے نکلا پھر مرگیا تو اس کے لیے قیامت تک عمرہ کرنے والے کا اجر لکھا جاتا رہے گا اور جو اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے نکلا اور مرگیا تو اس کے لیے قیامت تک غازی کا اجر لکھا جاتا رہے گا۔

امام بخاریؒ اور امام مسلم نے ذیل کی حدیث روایت کی ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما قال رجل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ایک شخص میدانِ عرفات میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعرفۃ اذ وقع عن راحلتہ فاقعصتہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اغسلوہ بماء وسدر وکفنوہ بثوبیہ ولا تخمروا راسہ ولا تحنطوہ فانہ یبعث یوم القیمۃ ملبیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے اونٹ پر سوار تھے کہ اچانک وہ اپنے اونٹ سے گر گئے اور اونٹ نے ان کی گردن توڑ دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو پانی اور بیری سے غسل دو اور انہیں کے دونوں کپڑوں کا کفن بناؤ اور ان کا سر نہ ڈھانکو اور نہ انہیں خوشبو لگاؤ اس لیے کہ قیامت کے دن تلبیہ (لبیک لبیک) پڑھتے ہوئے اٹھائے جائیں گے۔

(الترغیب والترہیب بحوالہ بخاری ومسلم)

سورۃ المنار کی مذکورہ بالا آیت اور احادیث کی توضیح نے جو اہم بالشان اصول ہمیں دیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ورسول کے کسی حکم پر مخلصانہ نیت اور اس کے لیے جدوجہد ذمہ داری کے اس بوجھ کو ہٹا دیتی ہے جو اس حکم نے انسان کے کندھے پر رکھا تھا۔ مانع کی وجہ سے بالفعل اس حکم کی عدم تعمیل کے باوجود وہ خدا کے سامنے سرخرو اور اس اجر کا مستحق ہو جاتا ہے جو اس حکم پر عمل کرنے والوں کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔

بات واضح ہو چکی ہے لیکن اقامتِ دین کے نصب العین سے اس کا گہرا تعلق ہے اس لیے اس کی مزید توضیح مقصود ہے۔ حج اور ہجرت کی گزشتہ مثالوں میں

ان اعمال سے مانع موت ہوتی ہے ۔ موت ایک ایسی چیز ہے جس پر انسان کی عدم قدرت بالکل واضح ہے ۔ شبہہ ہو سکتا ہے کہ شاید کسی دوسرے مانع کا یہ حکم نہ ہو ۔

اوپر جو اصول بیان کیا گیا ہے اس سے یہ شبہہ دور ہو جانا چاہیے لیکن احکام شرع میں ایسی منصوص مثالیں بھی موجود ہیں جو اس شبہے کو بالکل ختم کر دیتی ہیں ۔

قتال فی سبیل اللہ کو دین میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں امام وقت کی طرف سے اگر نفیر عام ہو جائے تو ہر بالغ ، تندرست مسلمان پر جہاد میں شرکت واجب ہوتی ہے ۔ اس صورت حال میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تندرست ہیں اور جہاد میں شرکت کر سکتے ہیں وہ دل کے پورے ولولے کے ساتھ شریک بھی ہونا چاہتے ہیں لیکن شرکت کے لیے سامان کی ضرورت ہے اور سامان ان کے پاس نہیں ہے دوڑ دھوپ کرتے ہیں کہ خود اس کا انتظام کر لیں لیکن وہ اپنے مال میں اس کی گنجائش نہیں پاتے وہ دوڑے ہوئے امام کے پاس جاتے ہیں کہ بیت المال سے ان کی مدد کی جائے لیکن بیت المال بھی خالی ہے ۔ وہ اب کیا کریں ۔ بے بس ہو کر روتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں اور غزوے میں شریک نہیں ہوتے ایسے افراد کا کیا حکم ہے ؟ شرکت جہاد کی ذمہ داری ان سے ساقط ہوتی یا نہیں ؟ اس غزوے کے اجر میں وہ شریک ہوئے یا نہیں ؟ کتاب و سنت دونوں میں اس کی تصریح موجود ہے ۔ ان کی مخلصانہ نیت اور سعی و کوشش نے نہ صرف یہ کہ شرکت جہاد کی ذمہ داری ختم کی بلکہ انہیں اجر میں بھی حصہ دار بنا دیا ۔ سورۂ توبہ کی آیت ۹۲ پڑھیے اس میں وہی نقشہ کھینچا گیا ہے جو اوپر گزرا ۔ اس آیت نے ایسے لوگوں کو الزام سے بری قرار دیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے خوش خبری سنائی ہے کہ وہ جہاد کے   اجر میں شریک ہو گئے بلکہ حضورؐ کے الفاظ تو یہ ہیں کہ مدینے میں قیام کے باوجود وہ سفرِ جہاد کے ہر مرحلے میں مجاہدین کے ساتھ رہے۔ معلوم ہوا کہ مخلصانہ نیت اور کوشش کے بعد موت سے کم درجے کا مانع بھی انسان کے سر سے ذمہ داری کا بوجھ ہٹا دیتا ہے اور اسے اجر کا مستحق بنا دیتا ہے۔

شرعی فرائض کی دوسری قسم

کچھ شرعی فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسی ذمہ داریوں میں یہ بات اور واضح ہے کہ ان کا مقصد جد و جہد اور سعی و کوشش کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہاں مامور کی ذمہ داری سرے سے یہ ہوتی ہی نہیں کہ وہ اس چیز کو وجود میں لے آئے بلکہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اسے وجود میں لانے کی سعی کرے اس کی واضح مثال اللہ کا یہ حکم ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اے مومنو! اپنے آپ کو اور
قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ	اپنے اہل کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ
اَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۱)	

یہ آیت دونوں قسم کے احکام کی جامع ہے ایک کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے اور ایک کا تعلق دوسروں سے ہے۔ ہم یہاں اب دوسری قسم کے احکام سے بحث کر رہے ہیں۔ یہ آیت ہر مسلمان کو اس کا بھی مکلف قرار دیتی ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اپنی اولاد کو بھی جہنم کی آگ سے بچائے۔ سوچیے، اس تکلیف اور اس ذمہ داری کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کا مطلب لیا جا سکتا

ہے کہ اللہ نے ہر مسلمان کو ذمہ دار قرار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی اولاد اور گھر کے دوسرے لوگوں کے دلوں میں ہدایت کا نور ڈال دے۔ انہیں خدا کا فرماں بردار بنا دے اور بہر حال انہیں خدا کی نافرمانیوں سے روک دے۔ ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کیونکہ یہ ذمہ داری تو اللہ نے اپنے رسولوں پر بھی نہیں ڈالی۔ ظاہر ہے مسلمانوں کو وہ اس کا مکلف کیسے قرار دے سکتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اور ان کی بیوی دونوں ہی خدا کی نافرمانی پر اڑے رہے اور عذاب الٰہی میں غرق ہوئے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بغاوت پر جمی رہی اور خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئی۔

جب یہ مطلب نہیں ہو سکتا۔ تو پھر اس ذمہ داری کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر مسلمان پر اپنی بیوی بچوں اور گھر کے دوسرے افراد کی اصلاح کے لیے سعی و جہد ضروری ہے۔ وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی وسعت کے اندر ان کی اچھی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے، نیکی پر انہیں ابھارتا رہے اور بدی کے انجام سے ڈراتا رہے ترغیب و ترہیب کی ہر ممکن صورت اختیار کرے۔ اگر اس نے یہ کر لیا تو اس کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ عین ممکن ہے کہ اس تمام جد و جہد کے باوجود بیوی اور بچے اصلاح پذیر نہ ہوں لیکن ان کو ہدایت یافتہ بنا دینا اس کے ذمہ نہ تھا اس لیے اس سلسلے میں اس سے باز پرس نہ ہو گی۔ تفسیر روح المعانی میں ایک روایت کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی ـــ یا رسول اللہ ہم پر اہل و عیال کو آگ سے بچانے کی ذمہ داری ڈالنے کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تم انہیں ان چیزوں سے

منع کرو جن سے اللہ نے تمہیں منع کیا ہے اور انہیں ان چیزوں کا حکم دو جن کا تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے تو اس طرح یہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف انہیں آگ سے بچانے کا سبب بن جائے گا۔ اس روایت نے تمام ایسی ذمہ داریوں کا مطلب واضح کر دیا ہے جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے احکام کی ایک اور مثال یہ ہے:۔

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ	اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس
الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا	میں مقابلہ کریں تو دونوں
فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (الحجرات ۱)	کے درمیان صلح کرا دو۔

یہاں بھی کہا گیا ہے "صلح کرا دو" اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کرو کیونکہ بالفعل دونوں گروہوں کے درمیان صلح کرا دینا کسی دوسرے انسان کے بس میں نہیں۔ اس کی قدرت میں جو کچھ ہے وہ کوشش ہے۔

ٹھیک یہی حال سورۂ شوریٰ کی آیت اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ کا بھی ہے۔ اقامتِ دین کا حکم انبیاء کرامؑ اور ان کے ماننے والوں کو ایسی قوم، ایسے ملک اور ایسے ماحول میں دیا گیا تھا جب کہ قوم کی غالب اکثریت خدا کی باغی اور دین حق سے منحرف تھی بلکہ پورا ملک اور اس کا ماحول خدا کا دشمن تھا۔ اس لیے کسی ایسی قوم میں اس کی ذمہ داری ڈالنے کا مطلب یہی ہے کہ اسے برپا کرنے کی جد و جہد کی جائے۔ شرک پر توحید کا غلبہ، باطل پر حق کا استیلاء اور مشرکین پر موحدین کی بالادستی اسی وقت ممکن ہے جب موانع راہ دور کر دیئے

گئے ہوں۔ اس کے بعد پورے دین کو بالفعل قائم کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اگر ہم نے پورے خلوص کے ساتھ اقامت دین کی جدوجہد جاری رکھی اور اسی راہ میں مر گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم اپنی ذمہ داری پوری کر لیں گے بلکہ انشاء اللہ اس اجر کے بھی مستحق ہوں گے جو اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔ اقامت دین کی مخلصانہ جدوجہد میں ناکامی کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کسی حکم پر عمل کرنے کی سعی کے بعد ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جانے کا معاملہ شرعی

نصوص ہی سے نہیں بلکہ عقل عام سے بھی ثابت ہے اور کوئی عاقل اس سے اختلاف نہیں کرتا فرض کیجیے۔ استاد نے کلاس میں اپنے ایک شاگرد سے کہا، جاؤ مدرسے کے گھڑوں یا نل سے ایک گلاس پانی لاؤ۔ شاگرد اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے ہر اس گھڑے کو دیکھا جس میں پانی ہو سکتا تھا لیکن کسی میں پانی موجود نہ تھا پھر اس نے نل سے پانی لینا چاہا مگر وہ بھی خشک تھا۔ استاد کے پاس واپس آ گیا اور عرض کی۔ کسی گھڑے میں موجود نہیں اور نل بھی خشک ہے۔ شاباش! کوئی حرج نہیں بیٹھ جاؤ۔ یہ تھا استاد کا جواب ـــــ کسی افسر اعلیٰ نے اپنے ماتحت افسر کو ایک مہم پر بھیجتے ہوئے حکم دیا جاؤ اس مہم کو سر کرو اور مجرم کو زندہ یا مردہ میرے سامنے حاضر کرو۔ چھوٹی سی پولیس فورس نے گھنے جنگل میں بڑی مشقت اٹھا کر ڈاکوؤں کی کمین گاہ کو گھیر لیا ڈاکوؤں کے سردار نے گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ ادھر سے بھی جواب میں گولیاں برسنے لگیں

اس مقابلہ میں ایک گولی، پولیس کے جواں سال افسر کا دل چیرتی ہوتی پشت سے باہر نکل گئی۔ ڈاکو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ماتحت افسر کی لاش، افسرِ اعلیٰ کے سامنے حاضر کی گئی وہ لاش سے لپٹ گیا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور پھر وہ لاش پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ دفن کر دی گئی اور حکومت نے اس افسر کی بیوی بچوں کے لیے وظیفے مقرر کر دیئے ـــــ یہ دو مثالیں، نادر مثالیں نہیں ہیں بلکہ اس طرح کی بیسیوں مثالیں روزانہ ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ شاگرد کو ایک گلاس پانی لانے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ پانی نہ لا سکا۔ ماتحت افسر پر مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی لیکن وہ مہم سر نہ کر سکا۔ بلکہ خود اپنی جان گنوا بیٹھا۔ اس کے باوجود استاد کی طرف سے شاباش اور حکومت کی طرف سے اعزاز و اکرام کے کیا معنے؟ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دو میں کسی نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی لیکن کیا فی الواقع بات یہی ہے؟ ذرا سا تامل واضح کر دیتا ہے کہ ان دونوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی تھی اور وہ دونوں جس بات کے مکلف گردانے گئے تھے، اس سے عہدہ برآ ہو چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ شاگرد کو شاباش ملتی اور نہ افسر کو اعزاز و اکرام نصیب ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر امر کے اندر یہ حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے کہ انسان کوشش کے بعد ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے پہلی مثال میں کون یہ کہہ سکتا ہے کہ شاگرد کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ گھڑوں اور نل میں پانی موجود پائے اور موجود نہ ہو تو پانی پیدا کر کے گلاس بھر لائے۔ دوسری مثال میں کسی

شخص کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ ماتحت افسر کی ذمہ داری یہ تھی کہ مجرم سے کسی حال میں شکست نہ کھائے اور اس کی گولی سے مرنے نہ پائے۔ عام حالات میں ہم جب کسی سے پانی مانگتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ پانی لاؤ۔ یہ نہیں کہتے کہ پانی لانے کی جدوجہد کرو۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب نے اگر پانی لانے کی کوشش کی اور کسی مانع کی وجہ سے نہ لاسکا تو وہ اپنی ذمہ داری پوری کرے گا اور کم سے کم ہماری ملامت یا سزا کا مستحق نہ ہوگا۔

آخر صرف فریضۂ اقامتِ دین کو ایک ایسا فریضہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ جب تک ہم بالفعل اسے انجام نہ دیں لیں، ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ اگر کسی شخص کے لیے یہ اندازِ فکر اس فریضے کو انجام دینے کی جدوجہد سے فرار کا بہانہ بن بھی جائے تو کیا یہ بہانہ خدا کے یہاں بھی چل جائے گا؟

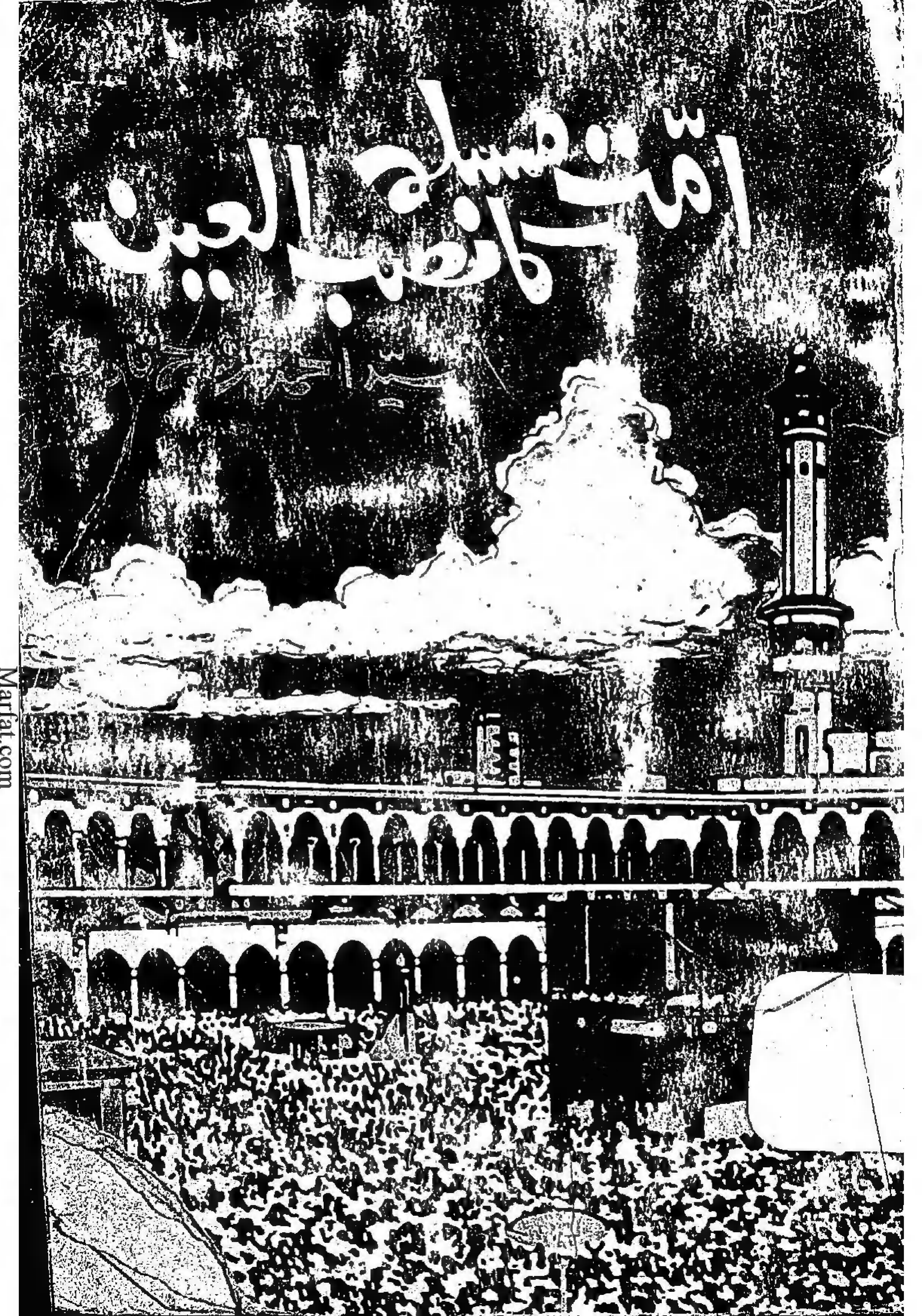
ناشر ـــــ سلیم احمد فاروقی
پبلشرز ـــــ اسلامک انٹرنیشنل پبلشرز
ریٹی گن روڈ، لاہور

بار اوّل ـــــ فروری ۱۹۸۲ء
۱۰۰۰

مطبوعہ ـــ المطبعۃ العربیۃ
۳۰- ایبٹ روڈ۔ بالمقابل [illegible] لاہور (پاکستان)

قیمت ـــــ بارہ روپے صرف

ملنے کا پتہ
المنار بک سنٹر ملتان روڈ چونگی منصورہ لاہور
البدر پبلیکیشنز راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور
مکتبہ تعمیر انسانیت اُردو بازار لاہور


امتِ مسلمہ کا نصب العین